ماہنامہ

ہمدرد

نونہال

نومبر ۱۹۸۶ء

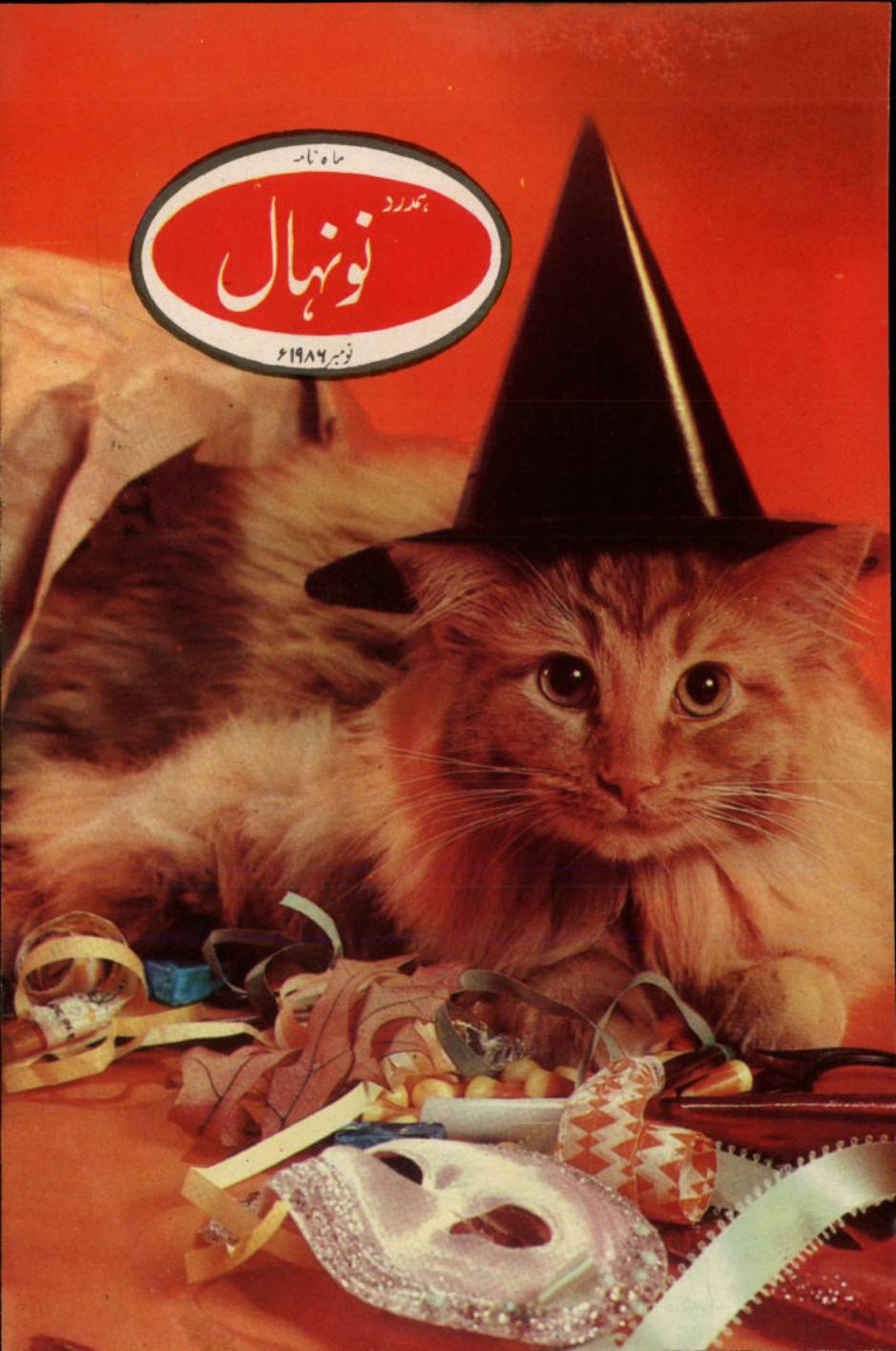

The winning name in biscuits
AB
now wins
world-wide
acclaim
IX
INTERNATIONAL
FOOD AWARD
SPAIN 1986
Honey biscuits
Chocolate cream biscuits
Orange cream biscuits
Marie biscuits
Saltesh biscuits
Nice biscuits
Bourbon biscuits
Milk Short Cake biscuits

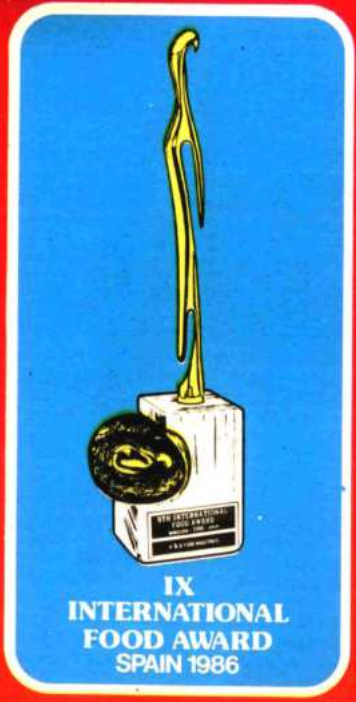

اِک نیا معیار
ڈیزائن بیشمار
گولڈ فِش ڈیلکس پینسل
Goldfish
DELUXE PENCIL
بین الاقوامی معیار کے مُطابق دیدہ زیب
ڈیزائنوں میں اپنی نوعیت کی واحد
گولڈ فش ڈیلکس پینسل۔
دیکھنے میں دلکش استعمال میں بہترین
گولڈ فش ڈیلکس پینسل
ہر دکان/اسٹور اور اسٹیشنرز سے
دستیاب ہیں۔
شاہ سنز لمیٹڈ
ڈی ۸۸-ایس-آئی-ٹی-ای-کراچی
فون: ۲۹۳۳۵۱، ۲۹۳۳۵۲

Midas Khi

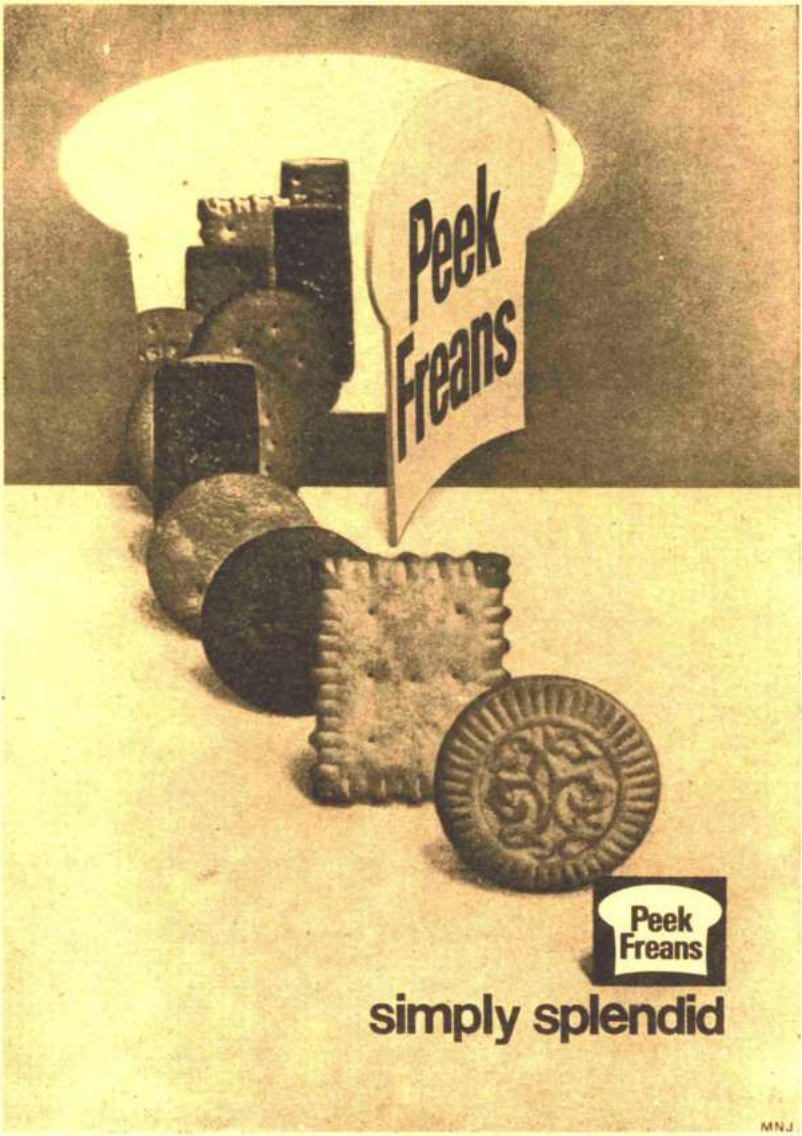
Peek
Freans
Peek
Freans
simply splendid
MNJ

فون: 616001 سے 616005 (پانچ لائنیں)

ہمدرد نونہال

رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

مجلس ادارت

صدر مجلس — حکیم محمد سعید

مدیر اعلا — مسعود احمد برکاتی

مدیرۂ اعزازی — سعدیہ راشد

ISSN 0259-3734 آئی ایس ایس این ۰۲۵۹-۳۷۳۴

ربیع الاول — ۱۴۰۷ ہجری

نومبر — ۱۹۸۶ عیسوی

جلد — ۳۴

شمارہ — ۱۱

قیمت فی شمارہ — ۴ روپے

سالانہ — ۴۵ روپے

سالانہ (رجسٹری سے) — ۸۱ روپے

پتا: ہمدرد نونہال
ہمدرد ڈاک خانہ
ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

ہمدرد فاؤنڈیشن (پاکستان) نے نونہالوں کی تعلیم و تربیت اور صحت و مسرت کے لیے شائع کیا۔

اس رسالے میں کیا ہے

جاگو جگاؤ	۵	جناب حکیم محمد سعید	بنّی کے دوست	۳۳	ادارہ
خیال کے پھول	۶	ننھے گلپیں	ایک یادگار سفر	۳۹	جناب علی اسد
کس نے جگایا	۷	جناب غنی دہلوی	ہمدرد انسائیکلوپیڈیا	۴۹	جناب علی ناصر زیدی
آپ کے چوبیس...	۹	جناب شکیل احمد عزیزی	کارٹون	۵۳	جناب مشتاق
تمباکو نوشی	۱۲	جناب احمد افضال	اخبار نونہال	۵۴	ننھے صحافی
وہ باہمّت لڑکا	۱۳	جناب میرزا ادیب	ایک عجیب ایجاد	۵۵	جناب روف پاریکھ
پتنگ (نظم)	۱۹	جناب دلاور فگار	تحفے	۵۷	باذوق نونہال
دریائی گھوڑا	۲۱	جناب مہروز اقبال	نونہال مصوّر	۶۱	ننھے آرٹسٹ
بچّوں کا ترانہ (نظم)	۲۳	جناب حسن عابد	وارث کی تلاش	۶۲	جناب مناظر صدیقی
دِلّی دُور ہے	۲۵	جناب م ندیم	معلومات عامہ ۲۴۷	۷۱	ادارہ
طب کی روشنی	۳۰	جناب حکیم محمد سعید	صحت مند نونہال	۷۳	ادارہ

● مسکراتے رہو ننھے مزاح نگار ۷۴ ● عجیب عجیب باتیں ادارہ ۷۷ ● بلا عنوان کہانی کا فیصلہ ادارہ ۷۸
● اس شمارے کے مشکل الفاظ ادارہ ۷۹ ● منتخب کہانیاں حنا فاروق ۸۱ ● نونہال ادیب ننھے لکھنے والے ۸۵
● ننھے قارئین لکھتے ہیں نونہال پڑھنے والے ۱۰۱ ● معلومات عامہ ۲۴۵ کے جوابات ادارہ ۱۰۷

اس رسالے کی تمام کہانیوں کے کردار اور واقعات فرضی ہیں۔ ان میں سے کسی کی کسی حقیقی شخص یا واقعے سے مطابقت محض اتفاقی ہو سکتی ہے جس کے لیے ادارہ ذمے دار نہ ہوگا۔

حکیم محمد سعید پبلشرز نے ماس پرنٹرز کراچی سے چھپوا کر ادارۂ مطبوعات ہمدرد نظم آباد کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا۔

جاگو جگاؤ

بزرگوں، عزیزوں، دوستوں اور ساتھیوں کا خیال رکھنے، ان کی بات ماننے اور ان کے کام آنے سے ہی آپس کے تعلقات خوش گوار رہتے ہیں، اس لیے ہر انسان کو دوسرے انسان کے کام آنا چاہیے، لیکن سب سے زیادہ اور سب سے پہلا حق ماں باپ کا ہے۔ ماں باپ کی اطاعت اور خدمت ہم پر فرض ہے۔ جب ہم چھوٹے ہوتے ہیں تو وہ ہماری خدمت کرتے ہیں، ہمیں پالنے کے لیے راتوں کو جاگتے ہیں اور ہم بیمار ہوتے ہیں تو وہ پریشان ہوتے ہیں۔ اگر وہ خود بھی بیمار ہوں تو وہ اپنا خیال نہیں کرتے، بلکہ ہماری دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ہمیں اچھے سے اچھا کھلاتے ہیں، اچھا پہناتے ہیں۔ اچھی تعلیم دلاتے ہیں۔ اگر ہم بڑے ہو کر ان کی خدمت نہ کریں، ان کا احترام نہ کریں، ان کا کہا نہ مانیں تو یہ کتنی ناانصافی بلکہ ظلم ہوگا۔

ہر شریف انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کی ہر بات کا خیال رکھے، خاص طور پر جب وہ بوڑھے اور کم زور ہو جائیں تو ان کو کوئی تکلیف نہ ہونے دے۔ اگر وہ کوئی غلط بات بھی کہیں تو جواب نہیں دینا چاہیے، بلکہ خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا بھی یہی حکم ہے اور ہمارے رسولؐ کا بھی یہی ارشاد ہے۔ والدین کی خدمت عبادت کے برابر ہے اور ایسی عبادت ہے جو جہاد سے بھی افضل ہے۔ خاص طور پر بوڑھے والدین کی خدمت تو بہت بڑی نیکی ہے، بلکہ میں یہ کہوں گا کہ تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔ بڑھاپے میں انسان دوسروں کا محتاج ہو جاتا ہے اس لیے اس وقت سہارے اور مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیک اولاد اپنے ماں باپ کے بڑھاپے کا سہارا ہوتی ہے۔

تمھارا دوست اور ہمدرد

حکیم محمد سعید

خیال کے پھول

✿ **حضور اکرمؐ** ۔۔۔ تم میں سے ہر شخص اپنے بھائی کا آئینہ ہے۔ مرسلہ: شائستہ انگبین، کراچی

✿ **حضرت علیؓ** ۔۔۔ سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ تم کسی کے اس عیب کا تذکرہ کرو جو خود تم میں موجود ہے۔

مرسلہ: شازیہ عزیز، سرگودھا

✿ **حضرت ابو ہریرہؓ** ۔۔۔ اصل پہلوان وہ ہے جو غصّہ کو ضبط کرے اور غصّے کی وجہ سے اللّٰہ کی نافرمانی میں مبتلا نہ ہو۔ مرسلہ: عبدالرحمٰن جمالی، جیکب آباد

✿ **مولانا رومیؒ** ۔۔۔ عدل سایہ دار درخت کو پانی دیتا ہے، جب کہ ظلم کانٹوں کی آبیاری کرتا ہے۔

مرسلہ: شازیہ عزیز، سرگودھا

✿ **حضرت بایزید بسطامیؒ** ۔۔۔ ایک عالم کی طاقت ایک لاکھ جاہلوں سے زیادہ ہوتی ہے۔

مرسلہ: شازیہ ایوب، اٹک

✿ **امام غزالیؒ** ۔۔۔ تین چیزیں انسان کو تباہ کر دیتی ہیں: حرص، حسد اور غرور۔ مرسلہ: سید محمد اطہر

✿ **علامہ اقبال** ۔۔۔ جب شاعر کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں تو دنیا کی آنکھیں بند رہتی ہیں، جب شاعر کی آنکھیں بند ہوتی ہیں تو دُنیا والوں کی آنکھیں کُھل جاتی ہیں۔

مرسلہ: محمد اسلم پرویز، کراچی

✿ **ابنِ خلدون** ۔۔۔ فن میں مہارت رکھنے والے دنیا سے محروم ہوتے ہیں اور اکثر و بیش تر کمینے سفلے اپنی چاپلوسی اور خوشامد کی وجہ سے بڑے بڑے عہدے لے اُڑتے ہیں۔ مرسلہ: شازیہ سعید مغل

✿ **ٹالسٹائی** ۔۔۔ حُسن وہ ہے جو نیکی کی طرف مائل کردے۔ مرسلہ: سرفراز عارف، کراچی

✿ **ایمرسن** ۔۔۔ جب بھی ہو سکے ہنسنے کی کوشش کرو۔ یہ بڑی سستی دوا ہے۔

مرسلہ: سید حسنات گیلانی، راول پنڈی

✿ **خلیل جبران خلیل** ۔۔۔ اس خوشی سے دُور رہو جو کل کو غم کا کانٹا بن کر دکھ دے۔

مرسلہ: محمد قیصر امام، کراچی

✿ **ارسطو** ۔۔۔ ہر ایک نئی چیز اچھی معلوم ہوتی ہے، مگر دوستی جتنی پرانی ہو گی اتنی ہی عمدہ اور مضبوط ہو گی۔

مرسلہ: عبدالقادر راجپوت، لاڑکانہ

✿ **پریم چند** ۔۔۔ شاعر وہ سپیرا ہے جس کی پٹاری میں سانپوں کے بجائے دل بند ہوتے ہیں۔

مرسلہ: عبدالرزاق ندیم، کراچی

✿ **شیخ سعدیؒ** ۔۔۔ علم حاصل کرنے کے لیے خود کو شمع کی طرح پگھلاؤ۔ مرسلہ: کاشف جلال، کراچی

کس نے جگایا

غنی دھلوی

قومی شاعر کون ہے بچّو
کس نے جگایا سوئے ہوؤں کو

آزادی کی شمع جلائی
بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھائی
قوم کی قسمت کس نے جگائی

قومی شاعر کون ہے بچّو
کس نے جگایا سوئے ہوؤں کو

قوم کے رُخ کو کس نے موڑا
آزادی پر کس نے اُبھارا
ذہنوں کو پھر کس نے بدلا

قومی شاعر کون ہے بچّو
کس نے جگایا سوئے ہوؤں کو

جس کا اِک اِک شعر ہوا میں
اُڑتا ہے آزاد فضا میں
پھیل رہا ہے بادِ صبا میں

قومی شاعر کون ہے بچّو
کس نے جگایا سوئے ہوؤں کو

شعر میں جس کے صبحِ وطن ہے
بول میں جس کے بوٹے چمن ہے
لفظوں میں سورج کی کرن ہے

قومی شاعر کون ہے بچّو
کس نے جگایا سوئے ہوؤں کو

تمام طلباء و طالبات کی دلپسند

نوٹ بکس

پی پی پی برانڈ

ملک بھر کے یوٹیلیٹی اور کینٹین اسٹورز اور اسٹیشنری کی
دوکانوں میں مقررہ داموں پر دستیاب ہیں۔

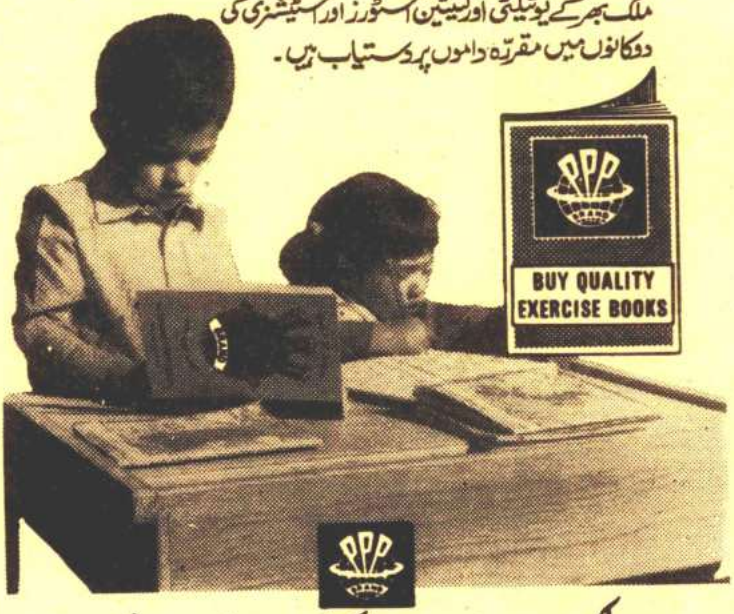

پاکستان پیپر پروڈکٹس لمیٹڈ

پوسٹ بکس نمبر ۷۴۳۸ - کراچی ۳

786/PPP-16/84

آپ کے چوبیس گھنٹے

شکیل احمد عزیزی، کراچی

آپ نے بہت سے لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہوگا کہ "بھئی میں کیا کروں، مجھے تو اخبار تک پڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔" یا "میں اپنی قابلیت اور ذوق کی بنیاد پر بہت اچھی کتاب تصنیف کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہوں، لیکن افسوس میرے پاس وقت اتنا نہیں ہے۔" یا "میں نے شوقیہ پیانو بجانا سیکھا ہے، لیکن اب مجھے اس کی مشق کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔"

یہ کیا راز ہے کہ کسی کو اپنا پسندیدہ کام کرنے کے لیے وقت نہیں ملتا۔ آج ہم ہر شخص کے بائیں ہاتھ پر بندھی ہوئی خوب صورت گھڑی دیکھتے ہیں، جس میں وہ بار بار وقت دیکھ کر چونک پڑتا ہے، "ارے آج کس قدر جلد وقت گزر گیا؟ اب میرا یہ خط پوسٹ بکس میں دورِ ڈلیوری تک رُکا رہے گا۔"

"لو بھئی، اب کیا ہوگا۔ لنچ کے وقفے تک تو سارا وقت کل کے بقایا کام کرنے میں صرف ہو گیا۔ ابھی تو میں نے آج کے کام کو ہاتھ ہی نہیں لگایا۔"

غرض جتنے لوگ ہیں وہ سب وقت کے شاکی نظر آتے ہیں، وقت زیادہ تر لوگوں کے لیے پھسلتی ہوئی مچھلی بن گیا ہے۔ بہت سے لوگوں کو اپنا کام کرنے کے لیے وقت نہیں ملتا، حال آنکہ ہم غور کریں تو قدرت نے دنیا میں وقت تقسیم کرنے میں بڑی فیاضی سے کام لیا ہے اور اس میں مساوات کا خاص طور سے خیال رکھا ہے۔ کروڑ پتی شخص ہو یا گلیوں میں پھرنے والا فقیر سب کے پاس دن کے چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں۔ ہم خواہ امیر ہوں یا غریب وقت کے معاملے میں مساوی درجہ رکھتے ہیں، لیکن سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ہم اپنے یہ چوبیس گھنٹے کس طرح صَرف کرتے ہیں؟

مشہور انگریز ادیب آرنلڈ بینٹ کی معروفیات کے بارے میں اگر آپ پڑھیں تو یہی خیال کریں گے کہ دن میں اس کے زیادہ تر اوقات یا تو اس کی ذاتی کشتی میں صرف ہوتے ہیں یا پیرس کورس میں۔ شام اور رات کا وہ تمام وقت کافی ہاؤسوں کی تقریبات، ڈنر پارٹیوں اور تھیٹر وغیرہ

میں گزار دیتا ہے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جب آرنلڈ بینٹ اپنے پورے ایک سال کے کاموں کا جائزہ لیتا ہے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ اس نے اس دوران کئی ضخیم کتابیں تصنیف کر ڈالیں، بہت سے نئے افسانے لکھ ڈالے، کئی ڈرامے مکمل کیے اور مختلف موضوعات پر کئی آرٹیکل شائع کروائے۔ حال آنکہ دوسرے لوگوں کی طرح اس کے پاس بھی سال کے بارہ مہینے، مہینے کے تیس دن اور دن کے چوبیس گھنٹوں سے زیادہ وقت نہیں تھا۔ واقعی آرنلڈ بینٹ نے یہ محیّر العقول کارنامہ کیسے انجام دے ڈالا؟ اس کے باوجود اس کے پاس سیر و تفریح، پارٹیوں اور تماشوں کے لیے کافی وقت بچ رہا ہے؟ اس سوال کا جواب آپ آرنلڈ بینٹ ہی کی زبان سے سُنیے:

"میں اپنے ان فاضل نصف گھنٹوں کو یوں ضائع نہیں ہونے دیتا جنھیں بہت سے لوگ بے مصرف گزار دیا کرتے ہیں۔"

آج کل مائیکل گلبرٹ جو لندن کا ایک معروف قانون داں ہے اور جسے دن میں ایک لمحہ بھی کسی دوسرے کام کے لیے وقت نہیں ملتا، بہت سی مقبول اور کام یاب کتابوں کا مُصنّف ہے۔ اُسے بھلا کب وقت مل سکا ہوگا جب اس نے اتنی کتابیں لکھ ڈالیں؟ وہ اپنے آفس واقع لندن سے جب اپنے گھر کے لیے روانہ ہوتا ہے جو مضافاتی علاقے میں واقع ہے تو کار یا ٹرین میں سفر کے دوران کچھ نہ کچھ ضرور لکھتا رہتا ہے۔ تین گھنٹوں کے سفر میں وہ اپنے تین چار صفحات ضرور لکھ ڈالتا ہے اور اس طرح اسے تیس دن میں نوّے صفحات لکھ ڈالنے کا پورا موقع مل جاتا ہے البتہ تعطیل کے دن اُسے کچھ لکھنے لکھانے کا پورا وقت ملتا ہوگا، جس میں وہ اپنی تمام کمیاں پوری کر لیتا ہے۔ عام لوگ سفر کے دوران یا تو اونگھتے رہتے ہیں اور یا گاڑی کی کھڑکی سے تیزی سے اوجھل ہو جانے والے مناظر دیکھتے رہتے ہیں۔ بعض افراد اخبار کے سرسری مطالعے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں، لیکن ان ہی اوقات میں گلبرٹ اپنے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر رہا ہوتا ہے جو بعد میں ٹھوس کتاب کی شکل میں شہر کے بک اسٹالوں پر فروخت ہوتے ہیں اور اس کی ذاتی آمدنی میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

جو شخص اپنے ان چوبیس گھنٹوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے وہی اس دنیا میں کوئی نمایاں اور شان دار کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔ سر ونسٹن چرچل کی مثال لے

لیجیے۔ انھوں نے پچھلی جنگِ عظیم کے بعد جو ضخیم کتابیں کئی جلدوں میں لکھیں وہ کوئی دوسرا شخص اپنی ساری زندگی تصنیف و تالیف میں صرف کر دینے کے بعد ہی لکھ سکتا تھا، لیکن انھوں نے ان ضخیم کتابوں کی تصنیف کے علاوہ ملکی سیاسیات میں بھی حصّہ لیا۔ اپنی پارٹی کے لیڈر بھی رہے۔ رنگین تصویریں بھی بناتے رہے، جن کی اکثر نمائشیں ہوتی رہتی تھیں۔ انھوں نے تصویر کشی کے فن پر ایک کتاب بھی لکھی جو ملک میں بے حد مقبول ہوئی۔ سر ونسٹن چرچل کی زندگی واقعی نہایت مصروف زندگی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انھیں اس قدر مصروفیتوں کے باوجود اتنے مواقع کیسے حاصل ہو سکے؟ انھوں نے کبھی اپنی زبان سے وقت کی کمی کی شکایت نہیں کی۔ آپ اپنے فاضل اوقات میں سے جتنا وقت کسی منعوت بخش مشغلے کے لیے نکال سکیں وہ غنیمت ہے۔ اس سے کم از کم آپ کو یہ حسرت باقی نہ رہ جائے گی کہ "افسوس مجھے اپنا وہ کام کرنے کا موقع نہ مل سکا"۔ دن میں کام کے اوقات میں اپنے پسندیدہ مشاغل کے لیے کوئی وقت یا وقفہ حاصل کرنا نہ صرف دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ ہاں فاضل اوقات میں سے ہم ضرور کچھ نہ کچھ وقت پا سکتے ہیں اور اس میں اپنے وہ کام کر سکتے ہیں جن کے ذریعہ سے آئندہ ترقی کے مراحل طے کر سکتے ہیں۔ ہمارے محلے میں ایک معمولی کلرک نے اپنے ان ہی فاضل اوقات میں مطالعہ کر کے یونی ورسٹی کے تمام امتحان پاس کیے اور آج وہ ایک بہت بڑا افسر ہے۔ اگر وہ اپنے فاضل اوقات سے مناسب فائدہ نہ اُٹھاتا تو کیا وہ کبھی ایک بڑا افسر بننے کا خیال بھی اپنے ذہن میں لا سکتا تھا۔ اس لیے اپنی زندگی کو شان دار بنانے کے لیے سب سے پہلے اپنے وقت کا صحیح استعمال کرنا سیکھیے۔

ایک حکایت

ایک بار شیخ سعدی شیراز کی ایک دعوت میں گئے۔ وہاں آپ کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ آپ چوں کہ عام کپڑوں میں ملبوس تھے لہٰذا کوئی متوجہ نہ ہوا۔ دوسرے روز آپ زرق برق کپڑے پہن کر گئے۔ آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور خوب آؤ بھگت کی گئی۔ جب کھانے کا وقت آیا تو سعدی صاحب نے سالن کی قاب اپنے کپڑوں پر انڈیل لی۔ لوگوں نے دریافت کیا، "حضرت یہ کیا؟"

آپ نے کہا، "ان کپڑوں کی عزت ہوئی ہے، انھیں ہی کھلا رہا ہوں"۔

مرسلہ: سید علی راشد کاظمی، کراچی

تمباکو نوشی

احمد افضال، کراچی

آج کل نوجوانوں میں سگرٹ نوشی کی عادت وبا کی طرح پھیلتی جا رہی ہے۔ تمباکو نوشی سے اُن کی صحت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ اس سے وہ کم زور ہونے لگتے ہیں اور اچھے کھلاڑی نہیں بن سکتے۔ چہرے پر جھائیاں پڑ جاتی ہیں، رنگ سیاہ اور انگلیاں زرد ہو جاتی ہیں۔ دانت بھی خراب ہو سکتے ہیں۔ تمباکو نوشی دراصل خودکشی کا قسط وار طریقہ ہے۔ ایک سگرٹ پینے سے طبعی عمر میں پانچ منٹ کم ہو جاتے ہیں۔ صرف برطانیہ میں سگرٹ نوشی کی بہ دولت پچاس ہزار افراد ہر سال وقت سے پہلے مر جاتے ہیں۔ سوچیے: کیا زندگی اتنی ہی سستی ہے کہ اسے دھوئیں میں تحلیل کر دیا جائے۔ تمباکو کے پتوں میں ایک زہریلا مادّہ مرکب حالت میں پایا جاتا ہے جسے نکوٹین کہتے ہیں۔ یہ زہر سگرٹ کے ساتھ انسانی جسم میں داخل ہو کر بدہضمی، زخم معدہ، سرطان، بلند فشارِ خون اور اختلاجِ قلب جیسی بیماریاں پیدا کرتا ہے۔ صاف صاف بتائیے: آپ سگرٹ نوشی پر اپنی صحت قربان کر سکتے ہیں؟

جدید تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ سگرٹ نوشی سے فالج کے حملے کا خطرہ دس فی صد، دل کے دورے کا اندیشہ بیس فی صد اور دِق اور دمے کا امکان تیس فی صد تک بڑھ جاتا ہے۔ تمباکو کے عادی اکثر نزلہ، کھانسی اور الرجی کا شکار رہتے ہیں۔ دل کی بیماریاں سگرٹ پینے والوں کو سگرٹ نہ پینے والوں کے مقابلے میں تین گنی زیادہ ہوتی ہیں۔ پھیپھڑے کا سرطان (کینسر) ایک مہلک بیماری ہے۔ اس مرض کا نشانہ بننے والوں میں سے نوّے فی صد سگرٹ نوشی کے عادی ہوتے ہیں۔ ایمان داری سے جواب دیجیے: آپ گوناگوں امراض اور خطرناک اور مہلک بیماریوں کو محض سگرٹ نوشی کے شوق کے لیے برداشت کرنے پر تیار ہیں۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ آگ لگنے کے حادثات میں سے تیس فی صد سگرٹ نوشی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سگرٹ ذہنی صلاحیت کو بڑھاتی ہے۔ ایسے لوگ سخت غلط فہمی کا شکار ہیں۔ سگرٹ نوشی دراصل دماغی اور جسمانی صلاحیتوں کو تباہ کرنے والی چیز ہے۔ اسے ترک کیے بغیر اچھی صحت برقرار نہیں رہ سکتی اور اچھی صحت کے بغیر اچھی ذہنی صلاحیتیں بھی پنپ نہیں سکتیں۔ سگرٹ نوشی ایک نشہ ہے۔ جس میں رُپے اور صحت کی بربادی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ اس مہلک عادت میں مبتلا ہیں وہ اس سے جلد از جلد چھٹکارا پانے کی کوشش کریں اور جو اس سے بچے ہوئے ہیں وہ دوسروں کو بھی بچانے کی کوشش کریں۔

وہ باہمّت لڑکا

مرزا ادیب

گاؤں کے بہت کم لوگوں کو 'میاں جی' کے پیدائشی نام کا علم تھا۔ سب انھیں 'میاں جی' ہی کہتے تھے۔

میاں جی کی عمر ۸۰ برس سے اوپر ہو چکی تھی۔ گھر سے سودا سلف لانے کے لیے دو تین بار باہر نکلتے تھے اور پھر واپس آ کر کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ شروع کر دیتے تھے۔ حقّہ پینا، کتابیں پڑھنا اور شام کے وقت بچّوں سے باتیں کرنا یا ان کو کوئی نئی کہانی سُنانا۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ شام ہوتے ہی وہ اپنا پرانا حقّہ سنبھال کر دالان میں آجاتے تھے جہاں ایک دری بچھی ہوتی تھی اور ایک طرف ایک گاؤ تکیہ رکھا ہوتا تھا۔ میاں جی اس گاؤ تکیے سے پشت لگا کر حقّے کی نلی ہونٹوں میں دبا کر اطمینان کے ساتھ بیٹھ جاتے تھے اور عین اس وقت بچّے آجاتے تھے۔ وہ تو اسی وقت کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ ان بچّوں میں میاں جی کی اپنی پوتیاں اور پوتے بھی ہوتے تھے۔

میاں جی کو بچّوں سے بڑا پیار تھا۔ کسی کو بھی آنے سے نہیں روکتے تھے اور جب تک سب کے سب اپنی خوشی سے چلے نہیں جاتے تھے وہ اپنی جگہ پر بیٹھے رہتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد وہ حقّہ لے کر اندر جا کر کچھ پڑھتے تھے اور پھر سو جاتے تھے۔

ہفتے کی شام تھی۔ بچّے میاں جی کے پاس پہنچ کر کسی نئی کہانی کا انتظار کر رہے تھے اور وہ مسکرا کر حقّے کے کش لگا رہے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ بچّے بے تابی سے انھیں دیکھ رہے ہیں اور کسی دل چسپ کہانی کی توقع کر رہے ہیں۔

کئی لمحے گزر گئے اور میاں جی مسکرا مسکرا کر ہی انھیں دیکھتے رہے۔ زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔

جب چند منٹ بیت گئے تو انھوں نے حقّے کی نلی منھ سے نکالی اور بولے، "تم میں سے کتنے بچّے ہیں جنھوں نے بڑی نہر کو دیکھا ہے؟"

آدھے بچّوں نے ہاتھ کھڑے کر کے "میں نے، میں نے" کا شور مچا دیا۔

"تو آدھے بچّے یہ نہر دیکھ چکے ہیں، مگر ان بچّوں کو بھی یہ علم نہیں ہو گا کہ اس نہر نے ہمارے گاؤں اور آس پاس کے سارے دیہات کو جہاں بہت فائدہ پہنچایا ہے وہاں ایک بار سخت نقصان بھی پہنچایا ہے۔ آج میں تمھیں بتاتا ہوں کہ وہ نقصان کیا تھا اور کیسے پہنچا تھا۔"

بچّے ذرا آگے کھسک آئے تاکہ میاں جی کی آواز آسانی اور سہولت سے سُن لیں، کیوں کہ بڑھاپے کی وجہ سے وہ کبھی کبھی تھک جاتے تھے تو ان کی آواز خاصی مدھم ہو جاتی تھی۔

میاں جی کہنے لگے، "ہوا یہ کہ ایک بار اس نہر میں بہت پانی آ گیا۔ کہیں زور کی بارش ہوئی اور کئی روز تک ہوتی رہی۔ بارش کا سارا پانی نہر میں آ گیا۔ نہر میں اس پانی کی گنجائش کہاں تھی طغیانی آ گئی۔ نہر ہمارے گاؤں کے درمیان میں سے بہتی ہے اس لیے ہمارا گاؤں اس کی زد میں آ گیا۔"

میاں جی ذرا رُکے۔ حقّے کا ایک لمبا کش لگایا اور بولے:

"اس طغیانی نے قیامت برپا کر دی۔ فصلیں تباہ ہو گئیں۔ کچّے مکان گر پڑے۔ ہر طرف پانی ہی پانی پھیل گیا۔ تباہی کی زیادہ وجہ یہ ہوئی کہ نہر کے پانی کے ساتھ اوپر سے بھی پانی برسنے لگا۔ ایسی

بارش ہوئی، ایسی بارش ہوئی کہ لوگوں کی جانیں خطرے میں پڑ گئیں۔ ہر ایک کو اپنی اپنی فکر دامن گیر ہو گئی۔ پانی بڑھتا اور پھیلتا جا رہا تھا اور لوگ گاؤں سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہت سارے نکلنے میں کام یاب ہو گئے تھے اور کچھ ڈوب بھی گئے تھے۔ اس گاؤں میں ایک مکان کے اندر ایک لڑکا جو بالکل تنہا تھا، سخت گھبرا رہا تھا۔ اُس کے ماں باپ اور بہن طغیانی آنے سے چند گھنٹے پہلے ایک قریبی گاؤں میں اپنے ایک عزیز کی شادی پر چلے گئے تھے اور لڑکے کو گھر کی حفاظت کی ذمے داری سونپ گئے تھے۔ گھر کے اندر اور باہر گہرا اندھیرا تھا۔ ابھی زیادہ پانی نہیں پھیلا تھا کہ اسے باہر سے کسی نے آواز دی کہ فوراً آجاؤ، مگر وہ نہ جا سکا، کیوں کہ دروازہ تلاش نہیں کر سکا تھا۔ وہ اندھیرے میں اِدھر اُدھر بڑی تیزی سے پھر رہا تھا۔ اور پانی دروازے کے راستے اندر آ رہا تھا۔ پہلے اُس کے گھٹنے پانی میں ڈوبے۔ اس کے بعد پانی پیٹ تک آ گیا۔ اگر وہ دو تین منٹ وہاں رہتا تو پانی اس کی گردن تک پہنچ جاتا اور وہ گھر کے اندر ہی ڈوب جاتا۔ وہ باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے خبر تھی کہ دروازہ کہاں ہے، مگر وہاں تک جا نہیں سکتا تھا۔ آخر دروازے تک پہنچ گیا، مگر پانی کا ریلا اسے بہا کر پھر اندر لے گیا۔

اسے یقین ہو گیا کہ اس کی موت آ چکی ہے اور وہ ڈوب کر مر جائے گا، لیکن اس کے اندر یکایک زندہ رہنے کی امید پیدا ہو گئی اور وہ نئے سرے سے جان بچانے کی کوشش کرنے لگا۔

میاں جی خاموش ہو گئے۔ بچے جانتے تھے کہ یہ میاں جی کی عادت تھی۔ وہ کہانی یا کوئی واقعہ سناتے وقت چند لمحوں کے لیے چپ ہو جاتے تھے۔ حقّے کا کش لگاتے تھے۔ کبھی کبھی پانی بھی پی لیتے تھے اور اس دوران میں بچے برابر ان کے چہرے کی طرف دیکھتے رہتے تھے۔

"تو میں نے تمھیں یہ بتایا تھا کہ وہ لڑکا اپنی جان بچانے کی کوشش کرنے لگا تھا۔"

وہ پھر خاموش ہو گئے۔

"یہاں تک بتایا تھا نا؟" میاں جی نے سوال کیا۔

"جی ہاں۔" لڑکوں نے بہ یک آواز کہا۔

"بڑھتا ہوا اندھیرا اور پانی۔ یہ دونوں چیزیں اس کے لیے سخت خطرناک بن گئی تھیں۔ پانی کا ایک زبردست ریلا آیا اور وہ پچھلی دیوار سے جا ٹکرایا۔ وہ موت کو قریب سے قریب آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ تاہم اس نے ہمّت نہ ہاری اور ایک بار پھر دروازے تک پہنچنے کی کوشش

کرنے لگا۔ دروازے سے باہر آکر وہ پانی کا مقابلہ کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ بڑھتا گیا، بڑھتا چلا گیا۔ کئی بار اس کے قدم اُکھڑ گئے مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ کوشش کرتے کرتے وہ بالکل نڈھال ہو گیا۔ تاہم وہ پوری طرح اپنی زندگی سے مایوس نہیں ہوا تھا۔ اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بارش زور سے برس رہی تھی۔ بجلی چمکتی تو وہ اس کی چمک میں اپنے چاروں طرف پانی ہی پانی دیکھتا۔ چمک ایک لمحے بعد ختم ہو جاتی تو پھر اندھیرا چھا جاتا۔"

میاں جی نے خاموشی اختیار کر لی اور حقّے کے کش لگانے لگے۔ لڑکے بڑی بے چینی سے یہ کہانی سُن رہے تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ کئی لمحے بیت گئے ہیں اور میاں جی چپ ہیں تو ان میں سے ایک بولا، "میاں جی! پھر کیا ہوا؟"

دوسرا کہنے لگا، "کیا وہ لڑکا ڈوب گیا یا بچ گیا؟"

میاں جی نے حقّے کی نلی اپنے دائیں ہاتھ سے ایک طرف کر دی اور مسکرا کر بولے:

"بچّو! اس لڑکے کے ساتھ کیا ہوا۔ یہ قصہ ہم یہیں چھوڑے دیتے ہیں اور اس وقت کی بات کرتے ہیں جب طغیانی کے بعد پانی اُترنے لگا تھا اور گاؤں کے لوگ واپس اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے تھے۔ لوگ لوٹ رہے تھے۔ ان کے دل دکھی تھے۔ دکھی کیوں تھے؟ کیوں کہ ہر گھر میں تباہی سے بڑا نقصان ہوا تھا۔ سامان بہ گیا تھا اور بعض مکانوں کی دیواریں بھی گر پڑی تھیں۔ سب دکھی تھے، مگر ایک گھر کے لوگ سب سے زیادہ دکھی تھے اور یہ وہ گھر تھا جس میں سے طغیانی کے وقت وہ لڑکا چلا گیا تھا اور واپس نہیں آیا تھا۔ اس کے باپ، ماں اور بہن کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ پانی میں بہ کر مر چکا ہے۔ تینوں بڑے غمگین تھے۔ باپ آہیں بھر رہا تھا۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور بہن زار و قطار رو رہی تھی۔ صبح کے وقت وہ گھر میں داخل ہوئے تھے اور دن کا تیسرا پہر گزر رہا تھا اور انھوں نے روٹی کا ایک لقمہ بھی حلق سے نیچے نہیں اُتارا تھا۔ ہمسائے انھیں تسلّی دے رہے تھے، مگر وہ صدمہ تو ایسا تھا کہ کسی قسم کی تسلّی سے بھی کم نہیں ہو سکتا تھا۔

تیسرے دن اچانک ایک عجیب واقعہ رونما ہو گیا۔ جانتے ہو کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ وہ لڑکا آگیا۔"

"زندہ سلامت؟" لڑکے پکار اُٹھے۔

"ہاں بچّو! زندہ سلامت۔ تم خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس کے مایوس ماں باپ اور بہن کو

کتنی خوشی ہوئی ہوگی۔ سب کا خوشی کے مارے عجیب حال تھا۔ وہ اللہ کا بار بار شکر ادا کر رہے تھے۔ ماں بار بار بیٹے کا ماتھا چومتی تھی۔ اب بھی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، مگر یہ خوشی کے آنسو تھے۔ تھوڑی دیر بعد لڑکا کہنے لگا:

اب میں بتاتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا بیتی۔ میں سمجھ چکا تھا کہ موت میرے بالکل قریب پہنچ چکی ہے۔ میں جلد ہی پانی میں ڈوب مروں گا، لیکن نہ جانے یہ یقین میرے دل میں کیسے پیدا ہو گیا تھا کہ اللہ مجھے بچالے گا اور اللہ نے سچ مچ مجھے بچالیا۔ میں نے اپنی رہی سہی ہمت سے کام لیا تھا اور پانی کے ریلوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ یکایک پانی کے ایک طاقت ور ریلے نے مجھے اُٹھا کر خشکی پر پھینک دیا۔ میری جان میں جان آئی۔ اس وقت میرے اندر ہلنے جلنے کی قوت نہیں تھی۔ دو تین گھنٹوں کے بعد میں اس قابل ہو گیا کہ کچھ سوچ سکوں اور کچھ حرکت کر سکوں۔ میں نے اُٹھ کر ایک درخت سے ٹیک لگادی۔ وقت گزرتا گیا، پانی اُترنے لگا۔ ذرا سی روشنی نظر آنے لگی۔ بھوک سے میرا برا حال تھا۔ خوش قسمتی یہ ہوئی کہ میں نے جس درخت کے تنے سے ٹیک لگائی تھی وہ آم کا پیڑ تھا۔ میں نے جھکی ہوئی شاخوں سے ڈھیر سارے آم توڑ لیے۔ ان کے کھانے سے میرے اندر ہمت عود کر آئی اور میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا، لیکن ابھی تو ہر طرف پانی تھا۔ ایک اور خوش قسمتی ہوئی۔ وہاں ایک کشتی آ گئی جو ان لوگوں کی تلاش میں اِدھر آ گئی تھی جو پانی میں گھر گئے تھے۔ اس کشتی میں کئی لوگ بیٹھے تھے۔ مجھے بھی اس میں بٹھالیا گیا۔ یہ کشتی مجھے ایک کیمپ میں لے گئی جو حکومت نے لگوایا تھا۔ وہاں کئی لوگ موجود تھے۔ سب کو روٹی ملی اور ہم سب پانی کے اُترنے کا انتظار کرنے لگے۔ آخر تین روز بعد پانی اُتر گیا اور سب اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ میرے لیے گھر تلاش کرنا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ گھر آ گیا اور اب سب کے سامنے ہوں۔"

لڑکے کے گھر والے پھر خدا کا شکر ادا کرنے لگے۔

"مگر یہ کہانی ختم نہیں ہوئی۔ کہانی کا وہ حصّہ جو سب سے ضروری ہے وہ تو میں نے سُنایا ہی نہیں۔"

یہ کہہ کر میاں جی مسکرانے لگے۔

"وہ کیا ہے؟" لڑکوں نے شور مچایا۔

میاں جی بولے:

"وہ لڑکا جس نے ہمّت سے کام لیا۔ سخت خطرناک حالات میں بھی مایوس نہ ہوا..... وہ کوئی اور نہیں تھا، میں تھا۔"

"آپ میاں جی؟"

لڑکے حیرت سے میاں جی کو دیکھنے لگے اور میاں جی نے مسکرا کر حقّے کی نلی ہونٹوں سے لگالی۔

پہچان

کسی شہر میں ایک خواجہ رہتا تھا۔ اس کا ایک دیہاتی سے دوستانہ تھا۔ دیہاتی ہر سال خواجہ کے ہاں آکر مہمان ٹھیرتا اور خواجہ اس کی بڑی خاطر مدارات کیا کرتا تھا۔ خواجہ کے ہاں دو ایک دعوتیں اُڑانے کے بعد جب کبھی یہ دیہاتی رخصت ہوتا تو اپنے عالی ہمّت میزبان سے ہمیشہ درخواست کرتا کہ وہ بھی کبھی اس کے گھر قدم رنجہ فرمائیں۔ آخر ایک برس اس کی دعوت پر خواجہ بال بچّوں سمیت دُور دراز کا سفر کرکے اپنے دیہاتی دوست کے ہاں گیا، لیکن اس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب دیہاتی نے توتے کی طرح آنکھیں پھیرتے ہوئے کہا، "تم کون ہو؟ میں نے تو ساری عمر تمھاری صورت تک نہیں دیکھی۔ یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

آخر بڑی بحث کے بعد دیہاتی نے کہا، "تم میرے باڑے کے چھپّر میں رات گزار سکتے ہو، بشرطیکہ رات کو پہرا بھی دو۔"

مرتا کیا نہ کرتا خواجہ بے چارہ مان گیا اور بھیڑ بکریوں کی حفاظت کے لیے تیر کمان لے کر چھپّر میں چلا گیا۔ وہ رات کو پہرے پر تھا کہ آدھی رات کے قریب اس نے گھپ اندھیرے میں کوئی جانور باڑے کی طرف آتا ہوا دیکھا۔ خواجہ سمجھا بھیڑیا ہے۔ جھٹ تیر چلّے میں رکھ کر نشانہ لیا اور پورے زور سے پھینکا۔ جانور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ خواجہ پکار اُٹھا، "بھیڑیا مارا گیا، بھیڑیا مارا گیا۔"

اس کی آواز سُن کر دہقان بھاگتا ہوا آیا اور دُور سے زمین پر پڑے ہوئے جانور کو دیکھ کر چلّایا، "ارے، تُو نے تو میرے گدھے کو مار دیا ہے۔"

خواجہ نے جواب دیا، "اس گھور اندھیرے میں تُو نے اپنے گدھے کو تو پہچان لیا، لیکن اس شخص کو تُو دن دہاڑے نہ پہچان سکا، جس کے گھر تُو نے برسوں دعوتیں اُڑائی تھیں۔" (مثنوی مولانا روم سے)

(امریکی نظم کا اردو نظم میں ترجمہ)

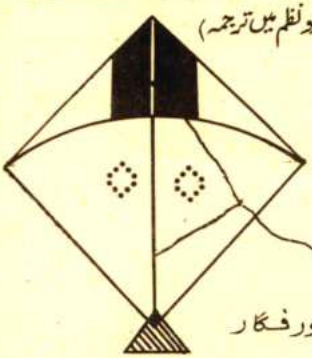

پتنگ

انگریزی: ہیری بہن • اردو: دلاور فگار

واہ وا کیسی چمکتی ہے پتنگ — جب نئے ہوتے ہیں اس کے شوخ رنگ
لو وہ ڈبکی کھا کے نیچے کو گئی — اس کی دُم تو ڈھونڈیے کیا ہو گئی
اللہ اللہ یہ نشیب اور یہ فراز — جیسے چلتا ہے سمندر میں جہاز
اب یہ گردابِ ہوا میں ہے رواں — اس کے کنّے اب ہیں اس کے بادباں
لو وہ اِک آندھی کی زد میں آ گئی — شام کے سورج کی حد میں آ گئی
اب ہوا کے زور میں آئی کمی — چل رہی جو ہوا، اب کچھ تھمی
یہ ہوا رُکتے ہی نیچے گر پڑی — اِک جگہ پر اب یہ ساکت ہے کھڑی
ڈور کو ملتی ہے جب تھوڑی سی ڈھیل — نیچے آ جاتی ہے یہ کاغذ کی چیل
دیں نہ جب تک کچھ ہوائیں اس کا ساتھ — کھینچتا رہتا ہے اس کو کوئی ہاتھ
کھینچتا رہتا ہے، جب تک بادِ نو — اس کو دیتی ہے سفر میں زادِ نو
پھر یہ سُوئے آسماں اُڑنے لگی — آ گئی بازو میں جاں اُڑنے لگی
واہ وا کیسی چمکتی ہے پتنگ — جب نئے ہوتے ہیں اس کے شوخ رنگ
اِن پتنگوں میں یہ مانا حُسن ہے — اِن سے بھدّی بھی نہیں ہے کوئی شے

جب پھنسی ہوں یہ سرِ شاخِ شجر
پھڑ پھڑائیں جب یہ اپنی ڈور پر

UNION INTRODUCES ANOTHER QUALITY PRODUCT

TOFFEES

REAL CHEWY CANDY

UNION The Biggest name in wholesome taste

Midas Khi

دریائی گھوڑا

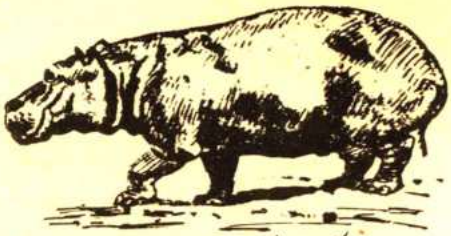

مہروز اقبال

دریائی گھوڑا خشکی کا دوسرا سب سے بڑا جانور ہے۔ یہ دریا میں رہنا پسند کرتا ہے اور اس کی زندگی کا بڑا حصّہ پانی ہی میں گزر جاتا ہے۔

ایک بالغ دریائی گھوڑے کا وزن چار ٹن، لمبائی بارہ فیٹ اور قد پانچ فیٹ کے قریب ہوتا ہے۔ اس کا جسم ایک بڑے ڈرم کی طرح ہوتا ہے جسے اس کی چھوٹی مضبوط ٹانگیں ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھائے پھرتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ دریائی گھوڑوں کا اصل وطن برّاعظم افریقہ ہے جہاں یہ بیس بیس اور چالیس چالیس کی ٹولیوں میں اپنا زیادہ تر وقت پانی میں گزار دیتے ہیں۔ یہ اچھے تیراک تو ہوتے ہیں البتہ زیادہ تیز نہیں تیر سکتے۔ تیرتے وقت یہ آہستہ آہستہ پاؤں چلاتے ہیں اور خوش ہو ہو کر ایک دوسرے پر پانی اچھالتے ہیں اور آوازیں نکالتے ہیں۔ عام طور پر یہ بہت چوکنا رہتے ہیں۔ جیسے ہی یہ خطرے کی بُو سونگھتے ہیں فوراً ماہر غوطہ خوروں کی طرح پانی کے اندر چھپ جاتے ہیں۔ ان میں صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ پانی کے اندر پانچ چھے منٹ تک اپنے کان اور نتھنے بند کیے رکھیں تاکہ پانی ان میں نہ جا سکے۔

دریائی گھوڑے کی کھال کافی موٹی ہوتی ہے، جس سے سرخی مائل بھورے رنگ کی تیل جیسی رقیق چیز خارج ہوتی ہے جو اسے دھوپ کی شدّت سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس کے سَر کا وزن ایک ٹن کے قریب ہوتا ہے اور جب یہ منھ کھولتا ہے تو بالکل ایک غار کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ کھانے کے دانتوں کے علاوہ ہاتھی کی طرح اس کے دو دانت ہوتے ہیں جو اوپر نیچے کے بجائے سیدھے باہر کی طرف نکلے رہتے ہیں، البتہ یہ ہاتھی دانت کے مقابلے میں چھوٹے ہوتے ہیں۔

دریائی گھوڑے کی آنکھیں چھوٹی ہوتی ہیں، جن سے یہ بہت اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا۔

اس کے سننے کی قوت بہت تیز ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے دشمنوں خاص طور سے گھڑیال کا پتا بڑی آسانی سے لگالیتا ہے۔ جب یہ چلتا ہے تو اس کے کان اس طرح حرکت کرتے ہیں کہ ایک کان آگے کی طرف جاتا ہے تو دوسرا پیچھے کی طرف۔ پھر دوسرا آگے اور پہلا پیچھے۔

پیدائش کے وقت دریائی گھوڑے کا بچّہ بدصورت سا ہوتا ہے، لیکن ماں کو اس پر بہت ناز ہوتا ہے۔ وہ اس کی بہت اچھی طرح پرورش کرتی ہے۔ دریائی گھوڑوں کے بچّے پانی اور خشکی دونوں جگہ پیدا ہوتے ہیں۔ پیدائش کے چند ہی منٹ بعد وہ تیر اور چل سکتے ہیں۔ پیدا ہوتے وقت بچّہ گلابی رنگ کا ہوتا ہے۔ ایک مہینے میں اس کا رنگ ماں باپ کی طرح بھورا خاکستری ہوجاتا ہے۔ پانی میں تیرتے وقت یا خشکی پر خوراک کی تلاش میں سفر کرتے وقت ماں بچّے کو اپنے سے الگ نہیں ہونے دیتی۔ اگر بچّہ غلطی سے کبھی اِدھر اُدھر چلا جائے تو ماں اپنے بڑے سر سے اس کی خوب پٹائی کرتی ہے۔ چار چھے مہینے کی عمر میں بچّہ گھاس کھانا شروع کر دیتا ہے۔

یہ معلوم کرکے شاید آپ کو تعجب ہوگا کہ دریائی گھوڑے خوراک کی تلاش میں غول کی شکل میں رات کو آٹھ سے دس میل تک دُور نکل جاتے ہیں۔ ان کی پسندیدہ غذا پھل، گھاس اور ہر قسم کی سبزی ہے۔ پانی کے پودے کھاکر تو دریائی گھوڑے کشتی رانی کے لیے راستہ صاف کرتے ہیں، لیکن یہ خشکی پر بڑی دھوم مچاتے ہیں۔ جو چیز یہ نہیں کھاتے اسے اپنے بھاری بھرکم پاؤں سے روند ڈالتے ہیں۔ دریائی گھوڑے تیس سال سے لے کر پچاس سال تک زندہ رہتے ہیں۔

بعض نونہال خطوط، مضامین، نظمیں، خبریں، تحفے، اخبار یا رسالے کے تراشے اور طب کی روشنی اور ہمدرد انسائکلو پیڈیا کے لیے سوالات بھیجتے وقت اپنا نام اور پتا نہیں لکھتے ہیں، جس کی وجہ سے اُن کا جواب دینے یا اُن کی بھیجی ہوئی چیزیں شائع کرنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ نونہالوں کو چاہیے کہ وہ جو چیز بھی بھیجیں اپنا مکمل نام اور پتا ضرور درج کریں۔ ہر تحریر الگ الگ کاغذ پر لکھیں اور ہر کاغذ پر اپنا نام اور پتا ضرور لکھیں۔

حسن عابد

بچّوں کا ترانہ

بڑھ کر ہلالِ شب سے بدرِ جہاں بنیں گے
ہم ننھّے منّے بچّے اِک دن جواں بنیں گے

چھوٹوں سے اور بڑوں سے اپنوں سے دوسروں سے
بولیں گے بول میٹھے شیریں زباں بنیں گے

مہکیں گے جس طرح گُل چہکیں گے جیسے بُلبل
ہم اپنے گلستاں کی روحِ رواں بنیں گے

چاہے گی ہم کو دنیا مانے گی ہم کو دنیا
ہم اس جہاں میں رہ کر جانِ جہاں بنیں گے

برسیں گے دوستوں پر یوں جیسے ابرِ رحمت
اور دشمنوں کے حق میں آتش فشاں بنیں گے

لہرائیں گے جہاں میں امن و اماں کا پرچم
اور ایک روز فخرِ دارالاماں بنیں گے

Adarts-HTP-2/85

م۔ ندیم

دِلّی دُور ہے

ایک قصبے میں ایک مرزا صاحب رہا کرتے تھے۔ وہ افیون کے شوقین تھے۔ صبح سے شام تک ان کے گھر افیونیوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ مرزا صاحب طبیعت کے نیک اور سخی قسم کے انسان تھے۔ اُن کے باپ دادا نے بہت ساری دولت چھوڑی تھی اور مرزا صاحب اس دولت

کو افیون پر خرچ کر رہے تھے، حال آنکہ مرنے والوں کے خیال میں وہ اتنی ساری دولت چھوڑے جا رہے تھے کہ ان کی سات پشتوں تک کام آئے گی، لیکن مرزا جس رفتار سے اسے اُڑا رہے تھے اس سے لگتا تھا کہ وہ دولت چند سالوں میں ہی ختم ہو جائے گی۔

دھیرے دھیرے باپ دادا کی جمع کی ہوئی دولت جب ختم ہونے لگی تو مرزا صاحب کو کچھ فکر ہوئی۔ دراصل ان کی یہ فکر اور پریشانی نہ بیوی کے لیے تھی اور نہ بچّوں کے لیے ان کا ایمان تھا کہ رزق دینے کا وعدہ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے مگر افیون کا انتظام بہرحال اُن کو خود ہی کرنا ہے۔ مرزا کی بیوی نے کئی بار اُن سے کہا کہ وہ گھر سے باہر نکلیں اور کوئی کام دیکھیں، لیکن مرزا صاحب نے زندگی میں آج تک اپنے اس قصبے سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ اس لیے وہ کہیں جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔

مرزا کی پریشانی دیکھ کر اُن کے ایک مخلص افیونی دوست نے ان کو مشورہ دیا:

"مرزا صاحب قبلہ، آپ کے باپ دادا سرکاری فوج میں ملازم تھے۔ اُن کی بہادری کی وجہ سے ان کو کئی تحفے اور انعامات بھی ملے تھے۔ سرکار میں آپ کے خاندان کی بہت ساکھ ہے۔ میرا مشورہ مانیں تو آپ بھی فوج میں بھرتی ہو جائیں۔ معقول تنخواہ اور کھانے پینے، اوڑھنے بچھانے کا سارا خرچ سرکار کے ذمے۔ مزے ہی مزے ہیں!"

"مگر وہاں افیون اور برفی اور بالائی وغیرہ کا معقول انتظام بھی ہو گا یا نہیں" مرزا صاحب نے پریشانی کا اظہار کیا۔

"لو مرزا صاحب۔ اماں سرکار کے ہاں کس چیز کی کمی؟ وہاں ہر طرح کی ضروریات کا انتظام ہے۔ آپ ذرا جا کر تو دیکھ لیں۔ اگر جھوٹ نکلے تو میرا نام پلٹ کر رکھ دیں!"

مرزا کے دوست نے کچھ ایسا یقین دلایا کہ وہ سرکاری نوکری کے لیے راضی ہو گئے اور انھوں نے بیوی کو صبح ہی صبح خوش خبری سنائی کہ وہ جلد ہی فوج میں نوکری کے لیے دلّی جا رہے ہیں۔

بیوی نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ چلو مرزا صاحب گھر سے باہر نکلنے کو تو تیار ہوئے۔ تین چار دن پہلے سے اُن کے سفر کا انتظام شروع ہو گیا۔ کھانے پینے کا سامان اور خاص کر مرزا کے شوق کی چیزوں کو اکٹھا کیا گیا۔

سفر کے وقت مرزا کے تمام افیونی دوست اور رشتے دار اللہ حافظ کہنے اکھٹے ہوئے، چوں کہ اس وقت تک مرزا کے قصبے سے ریل کا کوئی گزر نہ تھا اس لیے ان کو سڑک کے راستے گھوڑے پر بیٹھ کر یہ سفر طے کرنا تھا۔ ان کا نوکر فضلو ان کے ساتھ جا رہا تھا۔ دلّی کا سفر ان کے قصبے سے تقریباً ایک ہفتے کا تھا۔ رخصت کے وقت عجیب منظر تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ مرزا دلّی نہیں جا رہے تھے بلکہ آخری سفر پر جا رہے تھے۔ ایک افیونی دوست تو ان کے گلے سے لگ کر بہت رویا اور بولا:

"ہاں مرزا، یہ ظالم آسمان چند افیونی دوستوں کو مل کر کھاتے پیتے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ بھائی مرزا، کھاتے پیتے وقت اپنے اس دوست کی یاد میں ایک خوراک زیادہ کھا لیا کرنا۔ بس مجھے تسلّی ہو جائے گی۔" مرزا نے اسے تسلّی دی اور پھر سب دوستوں سے اپنی خطائیں معاف کرائیں، گلے ملے۔ یہ رسمیں ختم ہوئیں تو مرزا صاحب گھوڑے پر سوار ہوئے۔ گھوڑے کی لگام فضلو نے پکڑی۔ سارے دوست ان کو قصبے سے باہر تک اللہ حافظ کہنے آئے۔

چلتے چلتے دوپہر ہو گئی۔ ایک باغ میں سستانے اور کھانے پینے کے لیے ٹھیر گئے۔ کھانا کھایا، کچھ دیر آرام کیا اور پھر چل پڑے۔ مرزا صاحب جلد از جلد دلّی پہنچ جانا چاہتے تھے۔ رات ہوئی تو ایک سرائے میں قیام کیا۔ دن بھر کی تھکن تھی اور افیون نہ کھانے کی وجہ سے مرزا کے ہاتھ پیروں میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ کچھ یہی حال فضلو کا تھا۔ فضلو نے افیون تیار کی۔ دونوں نے نوشِ جان کی اور خوب سیر ہو کر کھانا کھایا اور پھر بالائی اور برفی کا دور چلا۔

صبح اُٹھ کر فضلو نے پھر خوراک تیار کی۔ مرزا نے تاکید کر دی تھی کہ آج کہیں دوپہر کو نہیں رُکیں گے بلکہ جس جگہ رات ہو گی وہیں رُکیں گے۔ اس لیے فضلو نے افیون کی خوراک ذرا تگڑی کر دی تھی۔ غرض خوب کھا پی کر دونوں دلّی کے لیے پھر روانہ ہو گئے۔ افیون نے اپنا اثر دکھلایا۔ نشے میں فضلو نے گھوڑے کا رُخ اسی طرف کر دیا جدھر سے دونوں آئے تھے۔ چلتے چلتے دوپہر ہو گئی۔ نہ مرزا نے رُکنے کو کہا اور نہ فضلو نے ہار مانی۔ گھوڑا بار بار رُک جاتا تو مرزا کہتے، "نہیں میاں اب منزل تو شام کو ہی ہو گی۔ چلے چلو اب دلّی دُور نہیں ہے۔"

شام کے وقت وہ ایک قصبے کے قریب پہنچ گئے۔ مرزا نے فضلو سے کہا، ارے میاں فضلو،

کیا اللہ کی شان ہے۔ بالکل ہمارے قصبے جیسا ماحول ہے۔ یہ ندی، یہ دھان کے کھیت، یہ آم کے پیڑ اور پن چکّی کی آواز، ایسا لگ رہا ہے جیسے میں اپنے کھیتوں کے پاس کھڑا ہوں۔"

میاں فضلو نے آنکھیں جھپکا کر ہاں میں ہاں ملائی۔ "میاں، آپ سچ کہتے ہیں، مگر یہ خواب سا ہے، بھلا ہمارا قصبہ کہاں، ہم تو اب پردیسی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو کبھی اپنے گھر پھر جانا نصیب ہوگا۔"

جب دونوں قصبے کے اندر پہنچے تو رات ہو چکی تھی اور اندھیرا چھا چکا تھا۔ مرزا صاحب بولے، "ارے میاں فضلو، ذرا دیکھنا کیا اللہ کی شان ہے۔ یہ سڑک، یہ بازار، یہ دکانیں، یہ سب ہمارے قصبے جیسا ہی ہے۔"

فضلو نے جواب دیا، "اجی میاں جی، یہ سب ہماری نظر کا دھوکا ہے۔ کسی فقیر نے خوب کہا ہے کہ یہ دنیا مایا جال ہے۔ وہم ہے خیال ہے۔ پردیس میں عجیب عجیب چیزیں نظر آتی ہیں۔ خیر اب کہیں رات بسر کرنے کی فکر کیجیے۔ اب تو مجھ سے ایک قدم بھی نہیں چلا جاتا۔"

"ہاں بھئی، اگر یہاں کوئی رئیس زادہ ہمارا ہم شوق مل جائے تو کیا کہنے۔ مہمان نوازی کا حق ادا کر دے گا۔" مرزا نے کہا، پھر ایک راہ گیر سے پوچھا، "میاں، یہاں کوئی ایسا شریف رئیس بھی ہے جس کو ذرا افیون کا شوق ہو اور ہم اس کے ہاں رات بسر کر سکیں۔"

"جی ہاں، یہاں ایک صاحب رہتے ہیں۔ اُن کا گھر اس سامنے والی گلی کے نکڑ پر ہے۔ مرزا صاحب ہیں آپ کے ہم ذوق۔" راہ گیر کی بات سُن کر مرزا بہت خوش ہوئے اور بولے: "بھئی فضلو، طلسمات کی حد ہو گئی، یعنی کہ یہاں بھی کوئی ہم جیسے ہی مرزا صاحب رہتے ہیں۔ وہ بھی ہمارے ہم ذوق۔ اللہ تیرے صدقے!"

دونوں کو مکان تک پہنچنے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ مکان دیکھ کر دونوں بھونچکے رہ گئے۔ "میاں ایسا لگتا ہے ضرور یہ مکان بھی اسی معمار نے بنایا ہوگا جس نے آپ کا بنایا ہے۔ قسم اللہ کی دونوں ایک ہی قسم کے ہیں۔" فضلو نے ہانک لگائی۔

"تم سچ کہتے ہو فضلو۔" مرزا نے غور سے دیکھ کر کہا۔

"کیا جناب مرزا صاحب اندر تشریف رکھتے ہیں۔ ہم پردیسی ہیں۔" فضلو نے آواز دی۔

خادمہ اندر سے نکلی۔ مرزا نے اسے دیکھا تو بے اختیار منھ سے نکلا،

"سبحان اللہ، کیا عجائبات عالم ہیں۔ دونوں ایک ہی ماں کی جائی۔ بال برابر فرق نہیں۔"
خادمہ تیز تھی، معاملہ بھانپ گئی۔ وہ بولی:
"میں بیٹھک کھولے دیتی ہوں آپ اندر آجائیں۔ میاں تو پردیس گئے ہیں۔"
دونوں اندر آگئے۔ دونوں بُری طرح تھکے ہوئے تھے اور نشے میں اونگھ رہے تھے۔ کمرے میں گھُستے ہی مرزا چارپائی پر دھم سے لیٹ گئے اور فضلو فرش پر پڑ گیا۔
خادمہ اندر آئی اور بولی، "جس چیز کی ضرورت ہو مانگ لیجیے گا تکلّف نہ کیجیے گا۔ آپ ہی کا گھر ہے۔"
"آں.... میرا گھر تو بہت دُور ہے۔ ہاں کچھ میرے ہی جیسا ہے۔ مرزا نے منمناتی ہوئی آواز میں کہا۔
گھوڑا اصطبل میں باندھ دیا گیا۔ مرزا نے منھ ہاتھ دھویا۔ کھانا کھایا اور حقّے کا کش لینے لگے۔ وہ بار بار اللہ کا شکر ادا کرتے تھے کہ یہ سارا ماحول ان کے گھر جیسا ہی ہے۔ اتنے میں پیچھے سے اُن کی پیٹھ پر ایک زور دار دھپ پڑی۔ مرزا گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دیکھا تو سامنے اُن کی بیگم کھڑی ہوئی تھیں۔
"ہائیں نیک بخت، تم یہاں کہاں؟"
"ہو آئے دلّی۔ کر آئے نوکری۔ نشہ بہت بُری بلا ہے۔" بیوی نے غصّے سے کہا۔
"ارے بیگم، اب تم ہی بتاؤ میرا کیا قصور ہے۔ میں تو دلّی گیا تھا۔ مگر جب تم گھر کو یونہی میرے ساتھ ساتھ لیے پھرو گی تو میں دلّی کیسے پہنچ سکتا ہوں؟ کسی نے سچ کہا ہے، دلّی بہت دُور ہے، یعنی ہنوز دلّی دُور است۔"

صحّت کی الف بے

مسعود احمد برکاتی

صحت کے اصول سادہ اور آسان ہیں صرف انھیں ذہن نشین کرنے اور اُن پر عمل کی ضرورت ہے۔ صحت کی الف ب میں صحت و تن درستی کی بنیادی باتیں آسان اور دل کش انداز میں پیش کی گئی ہیں

ہمدرد فاؤنڈیشن، ناظم آباد، کراچی ۱۸ ۵/ روپے

چہرے کا رنگ

س: عمر ۱۴ سال کوئی ایسا نسخہ بتائیے جس سے میرا رنگ گورا ہو جائے، لیکن چہرے پر داغ نہ پڑیں۔ شہناز قریشی، دادو سندھ

ج: انسانی چہرے کے رنگ اور نکھار کا تعلق بڑی حد تک عام صحت جسمانی سے ہے۔ اگر صحت ٹھیک ہے۔ خون صالح رواں دواں ہے تو چہرے کا نکھار قائم رہتا ہے۔ اس پر قناعت کرنی چاہیے۔ کالا رنگ گورا ہو جائے اس کی فکر چھوڑ دینی چاہیے، کیوں کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ یہ کالا رنگ کیا بُرا ہوتا ہے۔

ناک پر بھورے تل

س: میری بہن کی عمر ۱۶ سال ہے۔ ناک پر بہ کثرت بھورے تل ہیں، جن کی وجہ سے وہ بہت پریشان ہے۔ ازراہِ کرم جواب دے کر ممنوں فرمائیں۔ سید مسعود رضا، کوئٹہ

ج: بہ ظاہر ان تلوں کا کوئی علاج ممکن نہیں ہے۔ اس پر توجہ سے شاید اتنا فائدہ ہو سکتا ہے کہ تلوں میں اضافہ نہ ہو۔ آپ کی بہن کو بہ کثرت ہرا گھیا (لوکی، کدو، دراز) کھانا چاہیے۔ پکا کر یا اُبال کر۔ اس سے اصلاحِ خون کا امکان ہے۔ پھلوں کے رس بھی شاید مدد کریں۔ وٹامن سی ۵۰۰ ملی گرام روزانہ کا استعمال نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ گل منڈی کی چائے بھی شاید تلوں کا سلسلہ بند کر دے۔ دہی کی بالائی بھی تلوں پر لگا کر دیکھ لینا چاہیے۔ رات سوتے وقت مل لیں۔ کافی دن ایسا کریں۔

پانی زیادہ پینا

س: کیا یہ درست ہے کہ پانی زیادہ پینے کی وجہ سے گردوں پر بوجھ زیادہ پڑ جاتا ہے اور بہت کم عمر میں گُردے کام کرنا بند کر دیتے ہیں؟ زوھیب احسن، حیدرآباد

ج: یہ بات زیادہ صحیح نہیں ہے۔ ہمارے گردے دارو غۂ صفائی ہیں۔ ان کا کام بھی یہ ہے کہ خون میں سے خراب اجزا کو الگ کر کے خارج کرتے ہیں۔ ہر انسان کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ یہ مزاج ہی ہے کہ جو کبھی پانی کا زیادہ طلب گار ہوتا ہے اور کبھی کم۔ جسم کو جب پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو پیاس سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ جب پیاس لگے پانی پینا چاہیے۔ عام طور پر گرمیوں میں ایک صحت مند جسم کو ۱۰-۱۲ گلاس پانی کی حاجت ہوتی ہے۔ سردیوں میں یہ مانگ آدھی سے بھی کم رہ جاتی ہے، کیوں کہ سردیوں میں پسینہ نہیں آتا اور نہ جلد سے بخارات زیادہ خارج ہوتے سے جسم میں پانی کی کمی ہوتی ہے۔

پیشاب میں خون

س: عمر ۱۱ سال ہے۔ ایک ہفتے سے پیشاب میں خون آرہا ہے۔ کئی ڈاکٹروں سے علاج کرایا، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ براہ مہربانی کوئی علاج بتائیے۔

محمد ریاض بلوچ، کراچی

ج: بالکل ممکن ہے کہ کوئی ننھی سی پتھری ہو جو گردے مثانے کے درمیان نالی میں پھنسی ہوئی ہو اس سے خون آسکتا ہے۔ بات تو دُور کی ہے، مگر کیڑوں کی دوا سے آنتوں کو صاف کر لینا چاہیے۔ آپ فی الحال اپنا ایکس ریز کرائیے۔ اگر پتھری ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا علاج کرنا چاہیے۔

آپ نے اپنا پتا نہیں لکھا، کسی کو خط لکھنا اور اپنا پتا نہ لکھنا ایک اخلاقی کم زوری ہے۔ دوسرے ایسی بیماریوں میں فوری توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی بیماری کی صورت میں خط و کتابت کے بجائے کسی قریبی اچھے طبیب کو دکھانا چاہیے۔

سرمہ اور کاجل

س: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے سُرمہ لگانا سنّت ہے، لیکن میں نے سُنا ہے کہ سرمہ آنکھوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ اگر نقصان دہ ہے تو کیوں ہے اور اگر سرمہ لگانے

سے آنکھوں پر بُرا اثر پڑتا ہے تو کیا کاجل بھی آنکھوں کے لیے نقصان دہ ہے؟

انتیا نور، کراچی

ج سرمہ دراصل سرمہ ہونا چاہیے۔ ہوتا یہ ہے کہ ہم زیادہ رُپیہ کما لینے کی ہوس میں سرمہ میں ملاوٹیں کرنے لگے ہیں۔ آج کا انسان بے حس ہو کر دولت کے نشے میں مبتلا ہو کر اپنے بھائیوں کا دشمن بنا ہوا ہے۔ یہ قابلِ نفرت ہے۔ اچھا سرمہ اچھا سرمہ ہوتا ہے اور مفید۔ پھر جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اچھا فرمایا ہے تو بس اچھا ہے۔ اس پر کوئی بحث کرنی غلط ہے۔

جسمانی کم زوری

س: میری عمر ۱۸ سال ہے۔ پانچ سال قبل میں نے اپنی اندرونی قوت کا بے جا استعمال کر کے اپنی صحت خراب کر ڈالی ہے، لیکن دو برس سے میں نے اس بُری عادت سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے۔ بہ ظاہر میں صحت مند لگتا ہوں، مگر مجھے سخت جسمانی کم زوری محسوس ہوتی ہے۔ ازراہِ کرم کوئی مفید نسخہ تجویز فرمائیں۔

عبدالقادر جاگیرانی بلوچ ملاڑکانہ

ج: ہاں، آپ کی طرح جوانِ امروز اپنے ہاتھوں اپنی صحت تباہ کر رہا ہے اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت کو ضائع کر دیتا ہے۔ یہ سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ یہ جوانِ امروز ایک اور عذاب میں بھی مبتلا ہے، یعنی اتائی حکیم، ڈاکٹر ڈرا ڈرا کر اُسے غلط قسم کی دوائیں اور مالشیں دیتے ہیں۔ یہ علاج تباہ کن ہے۔ میرے جواں عبدالقادر! تم سب کچھ فراموش کر دو۔ توبہ کرو۔ نماز ادا کرو۔ زندگی کا مقصد قائم کرو۔ عمل اور محنت کرو۔ بس یہ علاج کافی ہے۔ فطرت خود تمام خرابیاں اور کم زوریاں دُور کر دیتی ہے۔ اتائیوں سے دُور رہو۔

کالم طب کی روشنی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا اندازہ آنے والے بے شمار خطوط سے ہو رہا ہے۔ اکثر نونہال اس قسم کے سوالات بھیج رہے ہیں جن کے جواب رسالے میں شائع نہیں کیے جا سکتے۔ ایسے نونہالوں کو چاہیے کہ وہ اپنا مکمل پتا ضرور لکھیں تاکہ انھیں خط کے ذریعہ سے ضروری مشورہ دیا جا سکے۔ مطب ہمدرد کے ماہر اطبا کسی معاوضے کے بغیر یہ خدمت انجام دیتے ہیں۔ جو نونہال اپنے سوالات کے جلد جوابات چاہتے ہیں وہ بھی اپنا پتا ضرور لکھیں۔ اگر آپ رسالے میں جواب چاہتے ہیں تب بھی اپنا پتا ضرور لکھیے۔

بنّی کے دوست

مناظر صدیق

کسی جنگل میں ایک بہت بڑے اور گھنے درخت کے نیچے ایک خرگوش نے اپنا مکان بنا رکھا تھا۔ اس خرگوش کا نام بنّی تھا۔ ایک دن بنّی کی آنکھ کھلی تو دن خاصا چڑھ چکا تھا۔ یوں بھی گرمی کا موسم تھا۔ بنّی نے سوچا کہ اسے جلدی جلدی ناشتا کر کے بازار چلے جانا چاہیے تاکہ سودا سلف لے آئے ورنہ گرمی بڑھ گئی تو گھر سے باہر نکلنا مشکل ہو جائے گا، چناں چہ بنّی نے جلدی جلدی منھ ہاتھ دھو کر رات کے بچے ہوئے کھانے سے ناشتا کیا، کپڑے بدلے، سودا لانے کی ٹوکری سنبھالی اور ٹوکری ہاتھ میں لے کر بازار جانے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ خرگوش اُچھلتا ہوا

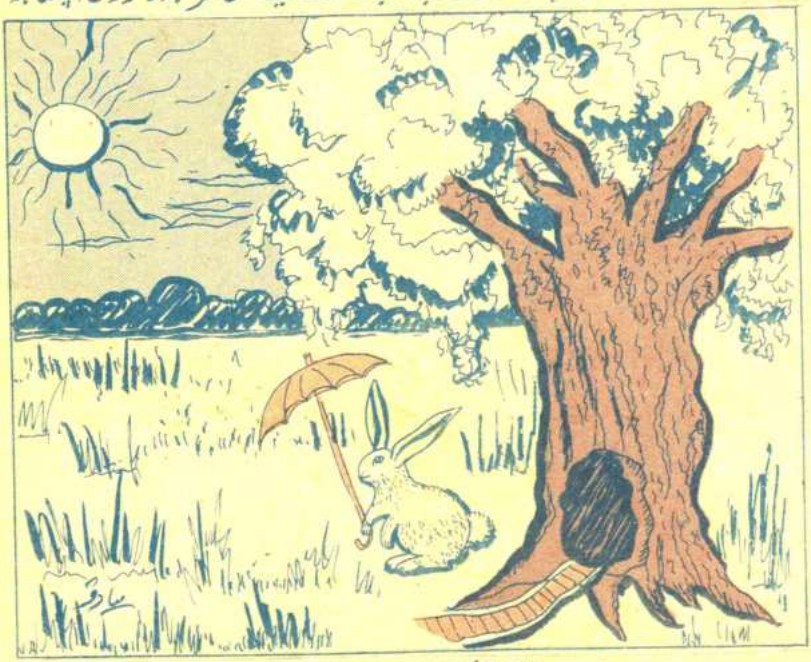

ایک دن بنی کی آنکھ کھلی تو دن خاصا چڑھ چکا تھا۔

اپنے گھر سے تھوڑی دُور پہنچا تھا کہ اسے ایک باریک سی آواز سُنائی دی:

"بھائی بنّی.... بھائی بنّی!"

بنّی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آواز کہاں سے آئی ہے۔ اُس نے اوپر دیکھا، نیچے دیکھا، اِدھر دیکھا، اُدھر دیکھا، لیکن آواز دینے والا نظر نہ آیا۔

"میں یہاں ہوں" آواز دوبارہ سنائی دی۔ اب بنّی نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ آواز تو قریب ہی اُگی ہوئی لمبی لمبی گھاس میں سے آ رہی ہے۔ اب اس نے گھور کر دیکھا تو وہاں چوہے میاں آنکھوں پر چشمہ لگائے کندھے پر ایک تھیلا لادے کھڑے تھے۔

"آہا! چوہے میاں۔ آپ کہاں؟" بنّی نے کچھ خوشی اور کچھ حیرت سے پوچھا۔

"میں نے سوچا، بنّی سے ملے ہوئے کئی دن ہو چکے ہیں اس لیے چلا آیا، لیکن تم تو کہیں جا رہے ہو؟" چوہے میاں نے کہا۔

"ہاں! ذرا بازار تک ارادہ ہے۔ آج کتنی گرمی ہے۔ سچ مچ جھلسا دینے والی گرمی، سوچا کہ جلدی سے سودا لے آؤں، ورنہ گرمی بڑھ گئی تو بازار تک پہنچنا بھی مشکل ہو جائے گا۔"

"ہاں! واقعی گرمی تو بہت ہے۔ تھوڑی دیر اور ہو گئی تو سچ مچ یہ گرمی جھلسا دے گی۔" چوہے میاں نے بنّی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے پوچھا "کہو تو میں بھی ساتھ چلوں؟"

"ضرور.... ضرور۔ بھلا اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟" بنّی نے کہا۔ پھر دونوں دوست بازار کی طرف چل دیے۔ بنّی اُچھلتا کودتا ہوا جا رہا تھا اور چوہے میاں کبھی دوڑتے اور کبھی چھلانگیں لگاتے۔ تھوڑی ہی دُور چلے ہوں گے کہ انھیں پھر ایک باریک سی آواز سنائی دی:

"بھائی بنّی! آداب۔ بھائی چوہے میاں آداب۔"

بنّی اور چوہے میاں کو ایسا محسوس ہوا جیسے آواز اُن کے پیروں کے پاس ہی سے آئی ہو، اس لیے پہلے تو انھوں نے نیچے دیکھا، پھر دائیں جانب اور پھر بائیں جانب، لیکن اُنھیں کوئی نظر نہ آیا۔

"میں یہاں ہوں" آواز دوبارہ سُنائی دی۔ اب انھیں آواز کی سمت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اُنھوں نے اُس سمت میں غور سے دیکھا تو لمبی گھاس کے درمیان میں انھیں ایک ننھّا منّا خوب صورت لال رنگ کا پرندہ نظر آیا۔ اس پرندے کو اس کے رنگ کی وجہ سے 'لال' ہی

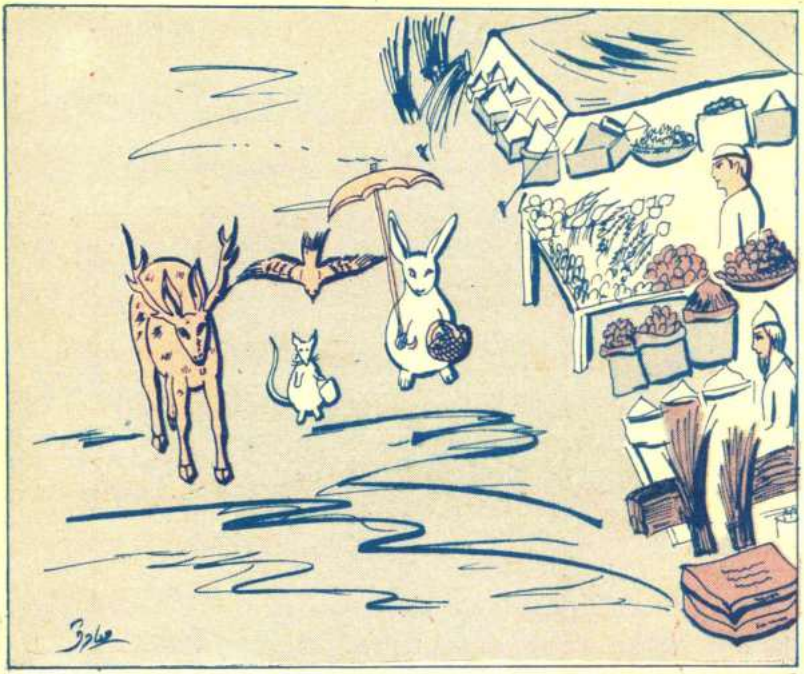

بنّی، لال، چوہے میاں اور ہرن بازار سے سودا خریدنے کے لیے روانہ ہوئے۔

کہتے ہیں۔

"واہ بھائی لال! تم تو بڑی سایہ دار جگہ تلاش کر کے بیٹھے ہو" بنّی اور چوہے میاں نے ایک ساتھ کہا۔

"ہاں بس! گرمی سے گھبرا کر ذرا دیر کے لیے یہاں رُک گیا تھا" لال نے جواب دیا۔

"واقعی گرمی بہت زیادہ ہے۔ سچ مچ جھلسا دینے والی گرمی" بنّی نے جواب دیا۔

"آپ لوگ کہاں جا رہے تھے؟" لال نے پوچھا۔

"سودا لینے بازار جا رہے تھے۔ گرمی زیادہ ہے نا! اس لیے سوچا تھا کہ جلدی سے سودا لے آئیں، ورنہ گرمی اور بڑھ گئی تو جھلس کر رہ جائیں گے" بنّی اور چوہے میاں نے جواب دیا۔

"میں بھی سودا لانے ہی کے لیے گھر سے نکلا ہوں۔ کہو تو تمھارے ساتھ ہی چلا چلوں؟"

لال نے پوچھا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ دو سے تین بھلے۔" بنّی نے کہا۔

بنّی اُچھلتا کودتا، چوہے خاں بھاگتے، چھلانگیں لگاتے اور لال صاحب کبھی پیدل چلتے اور کبھی اُڑتے ہوئے بازار کی سمت راستہ طے کرنے لگے۔ ابھی تینوں بازار کے قریب پہنچے ہی تھے کہ اُنھیں بھائی ہرن مل گئے۔ انھوں نے آواز دے کر تینوں کو روکا اور پوچھنے لگے کہ وہ تینوں کہاں جارہے ہیں۔

"جُھلسا دینے والی گرمی پڑ رہی ہے اس لیے بازار جارہے ہیں تاکہ اس سے پہلے کہ گرمی اور بڑھے اور ہمیں سچ مچ جھلسا دے ہم سودا لے کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔" بنّی، چوہے خاں اور لال میاں نے ایک ساتھ کہا۔

"بڑا اچھا خیال ہے۔ کہو تو میں بھی تمھارا ساتھ دوں؟" بھائی ہرن نے پوچھا۔

"اس سے اچھی کیا بات ہو گی۔ ضرور چلو۔" تینوں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ چاروں بازار میں پہنچ چکے تھے۔ بنّی نے اپنے لیے تازہ تازہ سبزیاں خریدیں۔ کچھ لیموں لیے اور شکر بھی خریدی۔ چوہے خاں نے اپنے لیے اناج، مکھن، پنیر اور بسکٹ خریدے، لال نے اپنے لیے پھل اور باجرے کے دانے خریدے۔ بھائی ہرن نے اپنے لیے خشک میوہ اور تھوڑا سا بھوسا خریدا۔ ابھی وہ یہ سب سامان خرید کر دُکان سے باہر نکلے بھی نہیں تھے کہ انھیں ایک زور دار کڑک سنائی دی۔ بنّی نے کہا، "یہ تو بجلی کی کڑک ہے۔"

چاروں جلدی سے دُکان کے باہر آئے اور آسمان کی طرف دیکھا۔ کالے کالے بادلوں نے سورج کو چُھپا دیا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بادل زور سے گرجتا بھی تھا اور بجلی بھی چمک رہی تھی۔

"بارش ہونے والی ہے۔ یہ بادل ایسے ہی ہیں۔ جب ایسے بادل چھاتے ہیں تو بارش ضرور ہوتی ہے۔" چوہے خاں نے کہا۔

"چلو جلدی کرو۔" بھائی ہرن گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے بولے، "تم تینوں میری پیٹھ پر چڑھ جاؤ۔"

اسی وقت بوندیں بھی پڑنے لگیں۔ بنّی، چوہا اور لال تینوں بھائی ہرن کی پیٹھ پر بیٹھ

گئے۔ انھوں نے لال کو اپنے درمیان بٹھالیا تھا۔ سب سے آگے چوہے خاں تھے۔ ان کے بعد لال اور سب سے پیچھے بنّی۔ یہ انتظام یعنی لال کو بیچ میں بٹھانے کا طریقہ انھوں نے اس لیے اختیار کیا تھا کہ لال کی حفاظت ہو سکے، کیوں کہ وہ بہت ننھا سا تھا۔ جب تینوں بیٹھ گئے تو بھائی ہرن پھرتی سے کھڑے ہو گئے اور چوکڑیاں بھرتے ہوئے بنّی کے گھر کی طرف چل پڑے۔ بنّی، چوہے خاں اور لال میاں نے مل کر بھائی ہرن کا سودا بھی سنبھال لیا تھا۔ بنّی ہی نے بھائی ہرن کو اپنے گھر چلنے کے لیے کہا تھا، کیوں کہ بنّی ہی کا گھر قریب بھی تھا اور وہیں وہ بارش رُکنے تک ٹھہر سکتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ بنّی کے گھر پہنچ گئے، لیکن بنّی کا گھر بہت چھوٹا تھا۔ اس لیے بنّی، چوہے خاں اور لال تو گھر کے اندر چلے گئے، لیکن بھائی ہرن گھر میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے صرف اپنا سر کھڑکی کے اندر کر لیا۔ غنیمت یہ تھا کہ بنّی کا گھر ایک

ہرن نے بنّی، چوہے اور لال کو اپنی پیٹھ پر بٹھالیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

بہت بڑے اور گھنے درخت کے نیچے تھا اس لیے بھائی ہرن کے بہت زیادہ بھیگ جانے کا خطرہ بھی نہیں تھا۔ بہرحال تھوڑی بہت بوندیں تو ان کے بدن پر پڑ ہی رہی تھیں۔

بتی نے گھر پہنچ کر بازار سے خریدے ہوئے لیموں اور شکر سے مزے دار شربت بنایا اور سب سے پہلے بھائی ہرن کو پیش کیا۔

"بھئی پہلے چوہے خاں اور لال میاں کو پلاؤ!" ہرن نے کہا۔

"نہیں پہلے آپ ہی کو پینا چاہیے، کیوں کہ آپ نہ ہوتے تو ہم اتنی جلدی یہاں کیسے پہنچتے اور بارش سے کیسے بچتے؟ میں تو بھیگ جانے کے بعد اُڑ بھی نہیں سکتا اور کیچڑ میں گر کر مر جاتا۔" لال نے کہا۔

"یہی حال میرا بھی ہوتا۔" چوہے خاں نے کہا۔ "میں بھی کیچڑ میں بھاگ نہیں سکتا۔"

"لیکن یہ بھی تو سوچو کہ بتی کا گھر اتنے قریب نہ ہوتا تو ہمیں اتنی جلدی پناہ کہاں ملتی؟" بھائی ہرن نے کہا۔

بتی نے کہا۔ "یہ بات نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ نہ ہوتے تو نہ ایک دوسرے کی مدد کر سکتے نہ ہم میں سے کوئی زندہ بچتا۔ اصل چیز تو ہم سب کی دوستی اور ساتھ رہنا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد بارش تھم گئی۔ سورج بھی نکل آیا۔ بھائی ہرن، چوہے خاں اور لال میاں بتی کو اللہ حافظ کہہ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

قصہ اژدہا پکڑنے کا

کتاب جس کو نیشنل بک کونسل پاکستان نے ۱۹۷۷ء کا پہلا انعام دیا

عام لوگ اژدہے کا نام سن کر کانپ اٹھتے ہیں، لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جن کا مشغلہ اژدہے پکڑنا ہے۔ اس کتاب میں آپ ایک ایسے ہی نڈر شخص کی کہانی پڑھیں گے۔ یہ اور بہت سی دوسری دلچسپ اور حیران کن باتیں آپ کو اس کتاب کی آٹھ کہانیوں میں ملیں گی۔

قیمت:- /۵ روپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد ڈاک خانہ، ناظم آباد کراچی ۱۸

ایک یادگار سفر

علی اسد

میرین نے ریل گاڑی کی کھڑکی نیچے گرا کر دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ ریل گاڑی آہستہ آہستہ فیسٹنگ اسٹیشن پر رکنے لگی۔ میرین کو لندن سے ویلس کے اس چھوٹے سے ساحلی قصبے تک پہنچنے میں دن بھر لگ گیا۔

"معلوم نہیں جون اور مارٹن اسٹیشن پہنچے یا نہیں؟" میرین دل میں سوچنے لگی۔ پھر جب گاڑی رک گئی تو وہ پلیٹ فارم پر اتر کر تیزی سے آگے بڑھی اور اپنا ٹکٹ دے دیا۔ اس نے چاروں طرف نظریں ڈالیں۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف ایک کوئلے کی گاڑی اور دو لاریاں کھڑی دکھائی دیں، چناں چہ وہ اپنے چچازاد بھائی بہن مارٹن اور جون کا انتظار کرنے لگی۔

اس نے جون اور مارٹن کو بہت دنوں سے نہیں دیکھا تھا، لہٰذا وہ اسکول کی چھٹیوں کو ان کے ساتھ گزارنے کے خیال سے بہت خوش ہو رہی تھی۔ میرین چودہ برس کی تھی اور جون بھی اتنی ہی تھی۔ مارٹن ایک سال بڑا تھا۔ جون اور مارٹن اپنے والد کے کام کی وجہ سے ویلس چلے گئے تھے۔ یہ لوگ ایک بہت بڑے مکان میں رہتے تھے جو قصبے سے کئی میل دور پہاڑیوں پر واقع تھا۔ طے تو یہی ہوا تھا کہ جون اور مارٹن اسٹیشن آ کر میرین کو لے جائیں گے، مگر وہ حسبِ عادت وقت پر نہیں پہنچے۔ میرین کو انتظار کا ایک ایک منٹ کاٹنا دشوار ہو رہا تھا۔ اسٹیشن بالکل سنسان تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک تگڑا سا آدمی مال گودام کے دفتر سے نکلا اور کھڑی ہوئی ایک لاری کے پاس گیا۔ میرین اسے دیکھنے لگی۔ اس آدمی نے لاری کا دروازہ کھولا۔ لاری میں سے ایک بڑا سا کتا اس تیزی سے اس آدمی پر جھپٹا کہ آدمی لڑکھڑا گیا۔ کتا لاری میں بند تھا، لہٰذا وہ باہر نکلنے کے لیے بے تاب تھا۔ آدمی فوراً سنبھل گیا اور کتے پر غصے سے چیخنے لگا۔ کتا اس آدمی کے چاروں طرف گھومتا رہا اور بھونکتا رہا۔

آدمی چلایا، "تیپچ اندر جا، دیکھو تو بلا اجازت باہر نکلنے کی تجھے کیسی سزا دیتا ہوں!" مگر کتا اور زور سے بھونکنے لگا۔ آدمی نے کتے کو پکڑنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ اس پر آدمی کو اور تاؤ آ گیا، "چل، اندر

جا!" کتّے نے اپنے مالک کا حکم نہ مانا اور بھونکتا رہا۔ بس پھر کیا تھا۔ آدمی نے اپنی چمڑے کی پیٹی کمر سے کھول لی اور کتّے کی طرف بڑھا، "دیکھ تو میں تجھ کو کیسا سبق سکھاتا ہوں" اتنا کہہ کر آدمی نے کتّے کو مارنا شروع کر دیا تھوڑی دیر میرین دیکھتی رہی، مگر پھر آخر یہ ظلم برداشت نہ کر سکی اور اس نے لپک کر آدمی کی کلائی پکڑ لی۔ وہ چلّائی:

"بس کرو۔ جانور کو اس طرح مارتے ہوئے تم کو شرم نہیں آتی!" آدمی اس طرح اچانک دخل دینے پر حیران رہ گیا اور غصّے سے میرین کی طرف گھوما۔ وہ بولا، "جا لڑکی، اپنا کام کر! یہ کتّا بڑا بگڑ گیا ہے۔ اسے سبق سکھانا ضروری ہے۔" میرین کو بھی غصہ آگیا۔ وہ کتّے کے پاس بیٹھ گئی اور اس کا سر سہلانے لگی۔ پھر اس آدمی سے کہا، "اب اگر تم نے اس کو مارا تو میں پولیس کو بلالوں گی۔" آدمی نے میرین کو غصّے سے دیکھا۔ مگر پھر وہ لاری میں سوار ہو گیا، "اچھا خیر، لیکن اب اگر یہ کتّا میرے قریب آیا تو میں اس کی کھال اُدھیڑ دوں گا۔ جاؤ تم اس کو لے جاؤ!" اتنا کہہ کر وہ لاری میں سوار ہو گیا۔ لاری روانہ ہو گئی۔ میرین نے کتّے سے کہا، "چلو، چھٹی ہوئی۔ اب تم جاؤ!" اتنا کہہ کر وہ اپنے سوٹ کیس کی طرف چلی گئی۔ کتّا بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ اتنے میں میرین کو قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

"اچھا تو تم آگئیں!" کسی نے کہا۔ وہ کھڑی ہو گئی، "ارے مارٹن ..... جون! تم کو حسب معمول دیر ہو گئی۔ میں کب سے تمھارا انتظار کر رہی ہوں۔" جون بولی، "ہم کو دیر ہو گئی۔ ڈیڈی کو کچھ خریداری کرنا تھی، وہ ابھی تک دکان میں ہیں، چلو" میرین نے اپنا سامان اٹھایا اور تینوں روانہ ہو گئے۔ کتّا بھی میرین کے پیچھے چل پڑا۔ میرین بولی، "کیا کروں؟ اس کتّے کو اپنے ساتھ تو میں لے جا نہیں سکتی۔" مارٹن بولا، "میں اس کتّے کو جانتا ہوں۔ یہ ہمارے پڑوسی مسٹر جاروس کا کتّا ہے۔ (وہ بڑا خراب آدمی ہے) لیکن یہ کتّا اب تم سے چپک گیا ہے، اسے آنے دو۔" میرین بولی، "بالکل تو ناراض نہیں ہوں گے؟"

جون نے کہا، "نہیں، وہ تو زیادہ تر باغ میں رہتے ہیں اور ہمارا کتّا گلیور بھی ان کے ساتھ رہتا ہے۔"

چناں چہ یہ کتّا جس کا نام پنچ تھا ان تینوں کے ساتھ گھر پہنچ گیا، لیکن اس وقت کسی کو یہ سان و گمان بھی نہ تھا کہ یہ کتّا بعد میں کس قدر کار آمد ثابت ہو گا۔ میرین کو مکان بہت پسند آیا۔ یہ بہت بڑا مکان تھا اور ایک اونچی پہاڑی پر واقع تھا۔ مکان سے ایک خوب صورت خلیج بھی دکھائی دیتی تھی۔ سمندر کی لہریں پہاڑی سے آکر ٹکراتی تھیں۔ میرین کے کمرے کی کھڑکی سے بھی سمندر دکھائی دیتا تھا۔

چائے تیار تھی۔ سب نے چائے پی۔ اس کے بعد میرین کو مکان اور اس کے قرب و جوار کی سیر کرانے

لے گئے۔ مارٹن بولا، "کل ہم تم کو پہاڑیوں کی سیر کرائیں گے۔" اتنے میں جون بولی، "میرین، تم کو بھوتوں سے ڈر تو نہیں لگتا؟" میرین نے کہا، "میں تو یہی نہیں مانتی کہ بھوت بھی ہوتے ہیں۔ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے؟"

مارٹن بولا، "ہاں یہی تو بات ہے۔ یوں تو ہم میں سے کسی نے بھی کوئی بھوت نہیں دیکھا ہے، مگر سب لوگ کہتے ہیں کہ یہاں بھوت ہیں اور اس میں حیرت کی بات بھی نہیں، کیوں کہ یہ مکان اتنا بڑا اور پرانا ہے کہ اس میں بھوت ہو سکتے ہیں۔" میرین بولی، "اگر مجھے بھوت دکھائی دیا تو یقین مانو میں اس کو اس بری طرح ڈراؤں گی کہ وہ پھر کبھی یہاں نہ آئے گا۔"

اس کے باوجود رات کو جب میرین سونے چلی، تو اسے کچھ گھبراہٹ ہوئی۔ اس کا کمرا بالائی منزل پر تھا۔ دروازے چرچراتے تھے۔ باہر اندھیرے میں کہیں الو بولنے لگا۔ میرین ڈر کر اچھل پڑی۔ پھر جب وہ رات کے

میرین کو غصہ آگیا اور وہ کتے کا سر سہلانے لگی۔

کپڑے پہننے لگی تو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کسی نے اس کے قمیص کی آستینوں کو اور پائنچوں کو سی دیا تھا۔ اس کے ہاتھ اندر جا کر پھنس گئے اسی طرح ٹانگیں بھی پھنس گئیں۔ میرین یہ سمجھ گئی کہ یہ جون کی شرارت ہوگی۔ بہر حال اس نے سلائی کھول ڈالی اور لباس تبدیل کر کے کھڑکی کے پاس گئی۔ دور بہت سے جہازوں کی روشنی دکھائی دے رہی تھی، مگر قریب ہی ساحل کے پاس کچھ تیز تیز روشنیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ سوچنے لگی کہ شاید یہ ماہی گیروں کی کشتیاں ہوں گی۔ اتنے میں وہ روشنیاں اچانک غائب ہوگئیں۔ میرین نے سوچا کہ صبح کو مارٹن اور جون سے اس بارے میں پوچھوں گی۔ وہ بتی بجھانے ہی والی تھی کہ کمرے کے باہر کچھ آہٹ سنائی دی۔ ذرا دیر کے لیے وہ ڈر گئی، مگر لباس کی آستینوں کی سلائی کا خیال کر کے وہ ہوشیار ہوگئی۔ اس نے دل میں کہا، "معلوم ہوتا ہے کہ آج رات کو مجھے بھوت دکھائی دے گا۔" اتنا کہہ کر وہ مسکرائی، "ذرا دیکھیں کہ اس بھوت کو پانی اچھا لگتا ہے یا نہیں۔" پھر اس نے پلاسٹک کے گلاس میں پانی بھرا اور بتی بجھا کر دروازہ ایک انچ کھولا۔ پھر کرسی پر کھڑے ہو کر گلاس کو دروازے کے اوپر سنبھال کر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ لیٹ گئی۔

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا۔ چند منٹ بعد دروازے کے باہر ہلکی آہٹ سنائی دی۔ وہ سانس روکے پڑی رہی۔ اور کسی بات کے ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ چند ہی منٹوں کے بعد دروازے کی ہلکی سی چرچراہٹ اور زنجیر کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ کھڑکی سے آنے والی ہلکی سی روشنی میں میرین نے دیکھا کہ دروازہ ذرا سا اور کھل گیا اور کوئی لمبی سی سفید چیز دکھائی دی۔ اسی کے ساتھ کسی کے کراہنے کی بھی آواز کمرے میں آئی۔ میرین ہنسی روکے لیٹی رہی۔ پھر دروازہ اور کھل گیا اور "بھوت" کمرے کے اندر داخل ہونے لگا۔

دھڑام! چھپاک چھپا!

پانی سے بھرا گلاس گر پڑا۔ "بھوت" انسان کی طرح چلایا اور بھاگ گیا۔ میرین کھلکھلا کر ہنسنے لگی، "مارٹن کو مجھے ڈرانے کا اب سبق مل گیا ہوگا۔"

دوسرے دن میرین صبح سویرے اٹھ گئی۔ وہ یہ دیکھ کر خوش ہوگئی کہ باغ میں الگنی پر ایک سفید چادر اور پاجامہ سوکھنے کے لیے لٹکا ہوا ہے۔ مگر مارٹن نے جب اس سے پوچھا کہ رات کو کیسی نیند آئی تو میرین نے بڑی خوش مزاجی سے کہا، "جب سناٹا ہوگیا تو میں نہایت سکون سے سوگئی۔ میرے خیال میں تمھارے بھوت نے مجھے ڈرانے کے لائق نہیں سمجھا۔"

یہ کہہ کر اس نے مارٹن اور جون کے چہروں کو دیکھا۔ دونوں بڑے مایوس نظر آئے۔

ناشتے کے بعد جون نے پیراکی کے لیے کہا۔ میرین بولی، "یہ تو بڑا اچھا ہوگا۔ کیا بہت

دور جانا ہوگا؟" مارٹن نے کہا، "نہیں، یہاں سمندر چٹانوں تک آجاتا ہے۔ اسی جگہ پر چند برس ہوئے کچھ پتھر لڑھک کر گر پڑے تھے۔ بس وہ جگہ مناسب ہے۔" چناں چہ تینوں پیراکی کا لباس پہن کر روانہ ہوگئے۔ پہلے مارٹن نے اوپر سے چھلانگ ماری۔ اس کے بعد اس کی بہن، پھر میرین بڑے احتیاط سے پانی میں کودی، کیوں کہ یہ جگہ اس کے لیے نئی تھی۔ جون اور مارٹن پانی کے اندر غائب ہوگئے۔ اچانک میرین چلائی، کیوں کہ پانی کے نیچے کسی نے اس کے پیر پکڑ لیے تھے اور اسے نیچے گھسیٹ رہا تھا۔ وہ اپنے پیر کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ آخر وہ ایک بار گی آزاد ہوگئی اور پانی کی سطح پر آگئی۔ اس نے دیکھا کہ مارٹن اور جون اس کے قریب ہی پیر رہے ہیں۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ مارٹن چلایا، "ہمارے بھوت کو ڈبونے کا سبق مل گیا۔" میرین چلاتی ہوئی ان کے پیچھے چلی، "جانور دیکھ تو میں کیسا مزا چکھاتی ہوں!" تھوڑی ہی دیر میں اس نے دونوں کو پکڑ لیا۔ پھر سب ہنستے ہوئے واپس ہوئے۔

میرین کو سمندر کی لہریں بہا کر ساحل پر لے گئیں۔

سہ پہر کو مارٹن نے کہا، "آؤ چلو میں تم کو طرح طرح کی چڑیاں دکھاؤں، اور ہاں خرگوش بھی ہیں اور بہت سے جنگلی پھول بھی ہیں۔" چناں چہ تینوں اپنے کتوں کے ساتھ پہاڑی راستے پر روانہ ہوگئے۔ تقریباً دو سو گز چلنے کے بعد یہ لوگ ایک کھیت کے پاس پہنچ گئے۔ مارٹن نے کہا کہ ہم کو کھیت کے کنارے کنارے چلنا چاہیے، کیوں کہ اس کے آگے جو کھیت اور زمین ہے وہ مسٹر جاروس کی ہے جس سے اسٹیشن پر تمھارا جھگڑا ہو چکا ہے۔ وہ بڑا بدمزاج آدمی ہے۔" چناں چہ یہ لوگ کنارے کنارے چلتے رہے۔ اتنے میں ایک خرگوش جھاڑیوں میں سے نکل پڑا۔ دونوں کتے اس پر جھپٹ پڑے۔ خرگوش جھکائیاں دیتا ہوا اپنی کھوہ میں چھپ گیا۔ اس کے بعد یہ لوگ آگے بڑھے۔ جھاڑیوں کے آگے ایک ٹوٹا پھوٹا مکان تھا۔ "وہ دیکھو مسٹر جاروس کا مکان۔" جون بولی۔ اس کے بولتے ہی کھلیان میں سے ایک تنگڑا سا کسان باہر آگیا۔ اور چلّاتا ہوا ان لوگوں کی طرف بڑھا۔ "میری زمین پر سے چلے جاؤ" وہ چلّایا۔ مارٹن نے کہا، "خاموش رہنا جون، ہم لوگ سرکاری سڑک پر ہیں۔" بیچ اپنے مالک کی آواز سنتے ہی دم دبا کر دور چلا گیا۔ قریب ہی دو بکرے چر رہے تھے کسان نے غصّے میں ایک بڑے بکرے کی رسّی کھول دی اور زور سے اس پر ہاتھ مار دیا۔ بکرا چیختا ہوا سیدھا ان تینوں کی طرف دوڑ پڑا۔ اس کے سینگ بڑے خطرناک تھے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ دونوں کتے بکرے پر بھونکنے لگے اور اس کا پیچھا کرنے لگے۔ بکرا میرین اور اس کے ساتھیوں کی جانب گھوم گیا۔ وہ تینوں گھبرا کر تیزی سے بھاگنے لگے، مگر بکرا میرین کے بالکل قریب آگیا۔ بیچ نے جو دیکھا کہ بکرا میرین پر حملہ کرنے والا ہے تو وہ بکرے کا پیچھا کرنے کے بجائے اس پر حملہ کرنے کے لیے دوڑ پڑا۔

اس گھبراہٹ میں میرین کو خیال نہ رہا کہ وہ کدھر بھاگ رہی ہے۔ وہ پہاڑی کے بالکل سرے پر پہنچ چکی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے چلّا کر اسے تنبیہ کی، مگر وہ سمجھ نہ سکی، چنانچہ وہ لڑکھڑا کر پہاڑی پر سے نیچے سمندر میں گر پڑی۔ مارٹن اور جون سہم کر دیکھتے رہ گئے۔ کسان نے بھی دیکھا ہوگا، مگر وہ غائب ہوگیا۔ مارٹن چلّایا، "جون! چلو ہم کو مدد کے لیے کسی کو بلانا ہوگا۔" جون رونے لگی، "وہ تو سمندر میں ڈوب گئی ہوگی۔ یہ سب ہماری غلطی ہے، ہمیں اس کو یہاں نہ لانا چاہیے تھا۔"

مارٹن بولا، "گھبراؤ نہیں، وہ بڑی اچھی پیراک ہے۔ بس یہ دعا کرو کہ کسی پتھر سے نہ ٹکرا گئی ہو۔"

چناں چہ یہ دونوں گھر پہنچے اور سب کو بتا دیا۔

گھبراہٹ میں کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ دو کتوں میں سے صرف ایک واپس آیا ہے۔ دراصل بیچ نے جب دیکھا کہ اس کی مالکن پہاڑی پر سے غائب ہوگئی ہے تو وہ تیزی سے پہاڑی پر سے اتر کر اس کے پاس پہنچنے کی کوشش

کرنے لگا۔ نیچے پہنچ کر وہ سمندر میں کود گیا اور میرین کو تلاش کرنے لگا۔

میرین نے اپنے حواس قائم رکھے اور گرتے وقت اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ اسے لندن میں اپنے والدین یاد آئے۔ آخر وہ پانی میں گر پڑی۔ وہ ڈوبتی چلی گئی۔ پھر اس نے اپنے آپ کو اوپر جاتے محسوس کیا۔ آخر وہ پانی کی سطح پر آ گئی۔ خوش قسمتی سے اب سمندر کی موجوں کا رخ ساحل کی جانب ہو گیا تھا، چنانچہ وہ بہتی ہوئی اونچی پہاڑیوں کی طرف چلی گئی۔ وہ ہاتھ پیر مارتی رہی اور چٹانوں کی ٹکر سے اپنے آپ کو بچاتی رہی۔ اتنے میں ایک چٹان اس کے بالکل قریب آ گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور چٹان سے ٹکرانے کے لیے تیار ہو گئی، مگر اچانک ایک عجیب و غریب بات ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ موجیں اسے نیچے کی طرف گھسیٹے لیے جا رہی ہیں۔ پانی کے نیچے ہی نیچے لہروں کے ایک تیز جھونکے نے اسے چٹان کی جانب پھینک دیا، اور پھر بڑے شور کے بعد تاریکی نے اسے گھیر لیا۔ دوسرے لمحے اس نے اپنے آپ کو نرم ریت پر پڑا پایا۔ سمندر اب پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ

مارٹن اور جاروس میں لڑائی ہوتے ہی کتا جاروس کی طرف لپکا۔

چاروں ہاتھ پیروں پر رینگتی ہوئی پانی کے باہر نکلی۔ یہاں بالکل اندھیرا تھا۔ میرین دھندلی روشنی میں ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کے بائیں جانب ٹھوس چٹان تھی اور اس کے سر کے اوپر گیلی گیلی چھت سی تھی اور اس کے آگے ریتیلا فرش اوپر کی جانب چلا جا رہا تھا۔

جب اس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں تو اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی غار کے دہانے میں ہے۔ ابھی وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ ہی لے رہی تھی کہ اتنے میں اسے کچھ آہٹ سنائی دی۔ اس نے گھوم کر جو دیکھا تو بیچ سامنے کھڑا تھا۔ کتا سمندر میں پیرنے کی وجہ سے بالکل نڈھال ہو گیا تھا۔ میرین غار میں آگے بڑھی آگے چل کر غار چوڑا ہو گیا۔ بہت اوپر چھت کے کسی سوراخ میں سے روشنی آ رہی تھی۔ میرین نے دیکھا کہ غار میں بہت سے بکس رکھے ہوئے ہیں۔ ان بکسوں میں غیر ملکی زبانوں میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ کچھ بکسوں میں سوئٹزرلینڈ کی گھڑیاں اور کچھ میں شراب کی بوتلیں تھیں۔ میرین بولی، "ارے یہ تو اسمگلروں کا اڈا معلوم ہوتا ہے، مگر بیچ یہ سامان یہاں کیسے پہنچا؟" وہ بے خیالی میں کتے سے باتیں کرنے لگی۔ پھر اسے وہ تیز روشنیاں یاد آئیں جو اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھی تھیں۔ وہ روشنیاں جو اچانک غائب ہو گئی تھیں۔ وہ خود ہی باتیں کرنے لگی، "ہاں ٹھیک تو ہے، غار کا دہانہ وہاں سے دکھائی دیتا ہو گا۔ اسمگلر رات کو غار میں آ جاتے ہیں اور بتیاں بجھا دیتے ہیں تاکہ دکھائی نہ دیں۔

غار کے پچھلے حصے میں میرین کو لکڑی کے زینے دکھائی دیئے جو اوپر کی جانب جاتے تھے۔ وہ ان زینوں پر چڑھنے لگی، مگر اوپر پہنچ کر وہ رک گئی، کیوں کہ وہاں پر چھت میں لکڑی کا ایک چور دروازہ تھا۔ وہ باہر سے بند تھا۔ میرین اسے کھول نہ سکی لہٰذا تھک کر زینے پر بیٹھ گئی۔ اتنے میں کچھ آہٹ سنائی دی۔ وہ جلدی سے نیچے چلی گئی اور شراب کے پیپوں کے پیچھے چھپ گئی۔ اتنے میں وہ چور دروازہ کھل گیا اور ایک آدمی نیچے اترنے لگا۔ بیچ میرین کے قریب تھا اس نے کتے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ وہ بھونکنے نہ پائے۔ میرین نے محسوس کیا کہ کتا کانپ رہا ہے۔ اس نے اوپر اس آدمی کو دیکھا تو پتا چلا کہ کتا کیوں کانپ رہا تھا۔ آنے والا آدمی وہی جاروس تھا جس سے میرین نے بیچ کی جان بچائی تھی اور جس کی بدولت وہ پہاڑی پر سے سمندر میں گری تھی۔ اس نے اپنے دل میں کہا، "یہی وجہ ہے جو یہ آدمی کسی کو ادھر نہیں آنے دیتا ہے۔ یہ اسمگلروں سے ملا ہوا ہو گا یا شاید ان کا سرغنہ ہو!"

جاروس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک کھلی ہوئی کتاب تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سامان کی جانچ کر رہا ہے۔ بڑی دیر کے بعد وہ مطمئن معلوم ہوا اور سیڑھیوں کی طرف جانے لگا۔ میرین کو خطرہ ٹلتا دکھائی دیا، مگر اتنے میں کتے کو چھینک آ گئی۔ اس آواز کو سنتے ہی جاروس رک گیا۔ "کون ہے؟"

وہ چلّایا اور ٹارچ کی روشنی ادھر ادھر ڈالنے لگا۔ روشنی آخر میرین پر پڑ گئی وہ سمجھ گئی کہ اب بچنا محال ہے، لہٰذا وہ آہستہ سے کھڑی ہو گئی۔ کتّا ڈر کر ایک کونے میں کھسک گیا۔ وہ بولا، "ارے تم پھر میرے کام میں مداخلت کر رہی ہو۔ اس بار تم حد سے زیادہ آگے نکل گئی ہو۔ تم یہاں آئیں کیسے؟"

میرین بولی، "سب تمھاری وجہ سے ہوا۔ تم نے اپنا بکرا میرے پیچھے دوڑا دیا اور میں پہاڑی پر سے سمندر میں گر گئی لہروں نے بہا کر مجھے یہاں پہنچا دیا۔"

وہ غصّے سے بولا، "یہ تو بڑا برا ہوا۔ چلو۔ ان زینوں پر چڑھو۔ تمھارے لیے کچھ کرنا ہوگا۔" چناں چہ وہ میرین کو زبردستی زینے پر لے گیا۔ جب یہ لوگ چور دروازے سے باہر پہنچ گئے تو اس نے چور دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔ میرین نے دیکھا کہ وہ ایک کھلیان میں کھڑی ہے جہاں کھیتی باڑی کا سامان رکھا ہوا ہے۔ جادوس نے میرین کو پکڑ کر اس کے ہاتھ پیر کس کر باندھ دیئے اور اس کے منھ میں رومال ٹھونس دیا۔ پھر وہ میرین کو وہاں بند کر کے چلا گیا۔ میرین نے اس کے قدموں کی چاپ سنی۔ پھر لاری کے چلنے کی آواز سنائی دی۔

ادھر گھر میں سب لوگ میرین کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔ پولیس کو بھی اطلاع کر دی گئی تھی اور کوسٹ گارڈ کو بھی۔ مارٹن اور جون پہاڑی کی چوٹی پر سے دوربین لگا کر دور دور دیکھتے رہے اور ایک دوسرے کو دلاسا دیتے رہے۔

ادھر میرین پیال پر پڑی ہوئی اپنے ہاتھ پیر کھولنے کی کوشش کرتی رہی، مگر کام یابی نہ ہو سکی۔ بہر حال بڑی مشکل سے اس نے اپنے منھ میں ٹھنسے ہوئے رومال کو زبان سے دھکیل کر نکال دیا اور مدد کے لیے چلّانے لگی۔ اتنے میں اسے کھلے ہوئے چور دروازے پر کچھ آہٹ سنائی دی۔ اور پیچ ادھر سے دم ہلاتا ہوا آ پہنچا۔ اس ہنگامے میں وہ پیچ کو بھول ہی گئی تھی۔ میرین نے فرش پر کھسکتے کھسکتے وہ رومال اٹھا لیا جو اس نے اپنے منھ سے گرا لیا تھا اور اس رومال کو پیچ کے گلے والے پٹّے میں اٹکا دیا۔ پھر اس نے کتّے سے کہا، گھر جاؤ، شاباش۔ جاؤ۔۔ گھر جاؤ!" پیچ دم ہلاتا رہا، مگر ٹس سے مس نہ ہوا۔ میرین اس سے برابر کہتی رہی۔ آخر وہ کھلیان کے دروازے کی طرف چلا گیا۔ دروازہ بند تھا، مگر دروازے کے نیچے چھوٹا سا گڈھا تھا، مگر وہ بہت تنگ تھا۔ پیچ تھوڑی دیر تو ادھر ادھر سونگھتا رہا۔ پھر اس نے اپنے پنجوں سے زمین کھودنا شروع کر دی اور اتنی جگہ نکال لی کہ اس میں سے وہ دبک کر نکل گیا۔

میرین پیال پر لیٹ گئی۔ بڑی دیر کے بعد باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ذرا ہی دیر میں پیچ آ گیا میرین زور سے چلّائی، "مدد کرو!"

باہر سے مارٹن کی آواز آئی، "میرین! تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"میں بندھی ہوئی ہوں ..... مجھے جلدی نکالو ورنہ جاردس آجائے گا!"

ایک دوسرا آدمی بولا، ذرا صبر کرو پولیس آگئی ہے۔ دروازے کے قفل کو توڑنا پڑے گا۔"

اس کے بعد دروازہ توڑ ڈالا گیا اور ایک سپاہی نے میرین کی رسیاں کاٹ ڈالیں دو سپاہی چور دروازے سے غار کے اندر گئے۔ تیسرے سپاہی نے میرین کو ایک کمبل میں لپیٹ دیا۔ اتنے میں پیچ غرانے لگا۔

میرین بولی، "سنو ایک لاری کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ یہ جاردس ہوگا!" پولیس کے سپاہی دروازے کے پیچھے چھپ گئے۔ جاردس نے آکر دروازہ جو کھلا دیکھا تو وہ چلایا، "ارے یہ کیا؟"

وہ فوراً دوڑ کر پھر لاری میں سوار ہو کر بھاگنا چاہتا تھا، مگر مارٹن نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور لاری کی چابی اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ دونوں میں دھینگا مشتی ہونے لگی۔ اتنے میں پیچ نے اچک کر جاردس کی ٹانگ پکڑ لی، چناں چہ ذرا سی دیر میں جاردس کے ہاتھوں پر ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔ وہ غصّے سے اپنے کتّے کی طرف دیکھتا رہ گیا، جس کے ساتھ وہ ہمیشہ ظلم کرتا رہا تھا۔

اس کے بعد ہر شخص بولنے لگا۔ میرین نے تمام واقعات سنائے۔ مارٹن نے بتایا کہ پیچ جب میرین کا رومال لے کر آیا اور بھونک بھونک کر پہاڑی کی طرف بھاگا تو ہم لوگ سمجھ گئے کہ وہ ہم کو ادھر لے جانا چاہتا ہے، چناں چہ وہ ہم لوگوں کو لے کر سیدھا میرین کے پاس آگیا۔ میرین نے کہا، "آج کا دن میرے لیے ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اب تو میں اس کتّے کے بغیر پہاڑی پر کبھی نہ جاؤں گی۔"

نونہال ادیب کے لیے جو نونہال مضامین اور کہانیاں بھیجتے ہیں اُنھیں چاہیے کہ مضمون یا کہانی مختصر لکھیں تاکہ جلد شائع ہو سکے۔ کوئی بھی تحریر صفحے کے ایک طرف حاشیہ اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں اور آخر میں اپنا نام اور مکمل پتا صاف اور خوشخط لکھیں۔ لفافے پر اپنا پتا لکھنے کے بجائے ہر تحریر کے آخر میں ضرور لکھیے۔ کسی شاعر کی نظم اگر بھیجیں تو شاعر کا نام ضرور لکھیں۔ اپنے نام سے ہرگز نہ بھیجیں۔ اسی طرح ترجمہ کی ہوئی کہانیوں میں مصنف اور کتاب کا حوالہ ضرور دیں۔

اہم موقعوں کی مناسبت سے لکھے جانے والے مضامین تین ماہ پہلے روانہ کریں۔ تاریخ، شخصیات، تحقیق، سائنس اور اہم واقعات پر لکھے گئے مضامین بھیجتے وقت ان کتابوں کا حوالہ ضرور دیں جن کی مدد سے آپ نے مضمون تیار کیا۔ ایسے مضامین لکھتے وقت آپ مختلف کتابوں سے تحقیق کر لیا کریں

علی ناصر زیدی

ہمدرد انسائیکلوپیڈیا

س: دوڑتے سے سانس کیوں پھول جاتا ہے؟ — وجے کمار گلاب، نواب شاہ

ج: ہمیں زندہ رہنے اور سانس لینے کے لیے اوکسی جن گیس کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ہم دوڑتے ہیں تو ہمارے جسم کو محنت اور زیادہ کام کرنا پڑتا ہے، خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے اور دل زیادہ تیزی سے ڈھڑکتا ہے۔ اُس وقت ہمیں معمول سے زیادہ اوکسی جن کی ضرورت ہوتی ہے، جسے اندر لے جانے کے لیے ہمارا منھ کھل جاتا ہے اور ہم زیادہ تیز سانس لینے لگتے ہیں، گویا ہمارا سانس پھول جاتا ہے۔

س: اُلّو کو دن کے وقت نظر کیوں نہیں آتا؟ — ارشد انجم، بہاول نگر

ج: یہ کہنا تو غلط ہو گا کہ الّو کو دن کے وقت بالکل نظر نہیں آتا۔ جنگل میں الّو اکثر ایک درخت سے دوسرے درخت پر دن کے وقت اُڑتے نظر آتے ہیں، لیکن اُس کی آنکھوں کی پُتلی کچھ اس طرح بنی ہوئی ہوتی ہے کہ رات کے اندھیرے میں وہ زیادہ پھیل جاتی ہے اور اُلّو کو رات کے وقت دن کے مقابلے میں زیادہ نظر آتا ہے۔

س: جب ہم چلتے ہیں تو ہمارے ہاتھ ہلتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

محمد حسین شاد، سرائے سدھو، کبیر والا

ج: ہمارے ہاتھ چلتے وقت ہمارا توازن برقرار رکھتے ہیں۔ ان کے ہلنے سے ہماری رفتار بھی بڑھ

جاتی ہے۔ جس آدمی کے ہاتھ نہ ہوں وہ اچھی طرح سنبھل کر نہیں چل سکتا، اُسے تیز چلنے یا دوڑنے میں بھی دقت ہوتی ہے۔ یہ ایک قدرتی عمل ہے۔ ہم شروع سے ہاتھوں کو حرکت دے کر اپنا توازن برقرار رکھنے اور تیز چلنے کے عادی ہوتے ہیں۔

س: کیمرا ہماری تصویر کس طرح اُتارتا ہے؟ سید ریاض امام رضوی، کراچی

ج: کیمرے کی بناوٹ ہماری آنکھ جیسی ہوتی ہے۔ اُس میں ننھا سوراخ ہوتا ہے، جسے روشنی کی کمی یا زیادتی کے مطابق تنگ یا چوڑا کیا جا سکتا ہے۔ باقی وہ چاروں طرف سے بند ہوتا ہے تاکہ اِدھر اُدھر کی روشنی اندر نہ داخل ہو سکے۔ اس میں سوراخ کو کھولنے بند کرنے کا انتظام ہوتا ہے۔ سوراخ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے کے لیے کھولا جاتا ہے۔ روشنی سوراخ میں داخل ہو کر سامنے لگی ہوئی فلم پر پڑتی ہے۔ فلم کی بناوٹ ایسی ہوتی ہے کہ وہ روشنی کے اثر کو فوراً قبول کرتی ہے اور سامنے کی چیز کی تصویر اُس پر اتر جاتی ہے۔ بعد میں فلم کو نکال کر کیمکلز (مسالوں) میں دھو لیا جاتا ہے اور تصویر اس پر اُبھر آتی ہے۔ اب فلم کے ذریعہ سے خاص قسم کے کاغذ پر تصویر یا پرنٹ تیار کر لیے جاتے ہیں۔ پہلے معمولی قسم کا بوکس کیمرا ہوتا تھا، لیکن فلم ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ فلم ایجاد ہوئی تو سیاہ سفید تصویریں حاصل ہونے لگیں۔ اب رنگ کا زمانہ ہے۔ فلم اور کاغذ دونوں رنگین تصویریں بنانے کے لیے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ سینما کی فلمیں، ٹیلے وژن، عام تصویریں سب رنگین آ رہی ہیں۔

س: برقی پنکھے کی چرخی کس طرح گھومتی ہے۔ محمد ایاز انصاری، کراچی

ج: بجلی اور مقناطیسیت میں قدرتی طور پر ایک تعلق پایا جاتا ہے۔ اگر یہ تعلق نہ ہوتا، تو بیسویں صدی کی یہ روئقیں ممکن نہ ہوتیں، جو آپ اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں۔ برقی پنکھے میں ایک نعل نما مقناطیس ہوتا ہے جس کے قطبین کے درمیان تاروں کا ایک لچھا ہوتا ہے، جسے آرمیچر کہتے ہیں۔ برقی رَو اس لچھے میں سے گزرتی ہے تو اس کا اپنا ایک مقناطیسی فیلڈ وجود میں آجاتا ہے۔ ایک مقناطیس پہلے سے موجود ہے۔ دونوں کے باہمی اثر سے پنکھے کی چرخی گھومنے لگتی ہے۔

س: ڈائی نیمو کس اصول پر کام کرتا ہے؟ محمد ایاز انصاری، کراچی

ج: ڈائی نیمو اُس آلے کو کہتے ہیں جو میکانیکی توانائی کو برقی توانائی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہاں بھی مقناطیسیت اور بجلی کا باہمی تعلق کام آتا ہے۔ مقناطیس کے دونوں قطبین کے درمیان تاروں کا لچھا ہوتا ہے، جسے آرمیچر کہتے ہیں۔ آرمیچر کو اگر کسی طرح زور سے گھمایا جائے تو وہ مقناطیسی خطوط کو کاٹتا ہے اور یوں اُس میں بجلی پیدا ہو جاتی ہے، جسے باہر نکالنے کا انتظام ہوتا ہے۔

س: انسان کے جسم میں پانی کتنے فی صد ہونا چاہیے؟ محمد جاوید عبدالغفور، کراچی

ج: انسانی جسم میں پانی کی شرح مقرر کرنا یا اُس پر نظر رکھنا تو ممکن نہیں، البتہ قدرت نے یہ خودکار نظام رکھا ہے کہ جب ہمارے جسم میں پانی کم ہو جاتا ہے تو ہمیں خود بہ خود پیاس لگتی ہے اور جسم اِس کمی کو پورا کر لیتا ہے۔ اسہال یا دست کی بیماری میں کمزوری کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہمارے جسم کا پانی کم ہو جاتا ہے۔ معالج زیادہ پانی پینے کی ہدایت کرتے ہیں۔

س: کیسٹ کے اندر آواز رِکارڈ کیسے ہوتی ہے اور اسے چلانے پر وہ آواز ہمیں کیسے سنائی دیتی ہے؟ صالحہ حسن، کراچی

ج: پہلی بات تو یہ یاد رکھیے کہ بجلی اور آواز، روشنی، مقناطیسیت وغیرہ کے درمیان قدرتی طور پر ایک تعلق پایا جاتا ہے۔ اگر یہ تعلق موجود نہ ہوتا تو ہمارے چاروں طرف یہ رونق اور یہ ایجادات موجود نہ ہوتیں جو آپ دیکھتے ہیں۔ کیسٹ کے اندر جو فیتہ یا ٹیپ استعمال ہوتا ہے اس پر ایک مسالا چڑھا ہوا ہوتا ہے، جو برقی مقناطیسی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ جب اس میں آواز بھری جاتی ہے تو آواز برقی ارتعاشات میں تبدیل ہو کر اس فیتے میں محفوظ ہو جاتی ہے اور جب آپ اسے چلاتے ہیں تو برعکس عمل ہوتا ہے، یعنی برقی ارتعاشات آواز میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور آپ اصل نغمہ سُن لیتے ہیں۔

الائیڈ بینک کی ہر ساعت
خوشحال پاکستان سے عبارت

ABL
ABL
ABL
ABL

الائیڈ بینک کو
یہ شرف حاصل ہے کہ وہ سرزمینِ پاکستان پر
قائم ہونے والا قدیم ترین بینک ہے۔
الائیڈ بینک اسلامی بینکاری کے نفاذ اور فروغ
سے ملکی خوشحالی کے لئے ہر ہر لمحہ مصروفِ عمل ہے
وقت کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اب کمپیوٹر کی تنصیب کے بعد
ہماری خدمات کے معیار اور ہمارے کرم فرماؤں کی سہولتوں
میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔

ABL
الائیڈ بینک
آف پاکستان لمیٹڈ
-خدمت کے ایک نئے جذبے کے ساتھ

PID · Islamabad 1-85 R

PARAGON

سیٹھ صاحب! آپ فیکٹری میں کیا تیار کراتے ہیں جس سے آگ لگ گئی؟
آگ بجھانے کا سامان۔
فیکٹری

ارے بیٹا! آج میں بہت تھک گیا ہوں۔ سارا دن مجھے دفتر میں فون پر بیٹھنا پڑا۔
ابو، کیا آپ کے دفتر میں کرسی نہیں ہے، جو آپ کو فون پر بیٹھنا پڑا۔

اخبارِ نونہال

۱۴۰ سال کی عمر

فیصل آباد شہر کے سب سے زیادہ عمر والے شخص حاجی اللہ دتہ کا محلہ کوثر آباد میں حال ہی میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ایک سو چالیس سال تھی۔ مرحوم کے اسّی کے قریب پوتے پوتیاں تھیں

مرسلہ: عتیق الرحمٰن کھوکھر محلہ، حیدرآباد

تیرتی ہوئی یونی ورسٹی

۱۹۷۰ء میں دنیا کی واحد تیرتی ہوئی یونی ورسٹی مشہور بحری جہاز کونُ الزبتھ میں قائم ہوئی ہے۔ یہ ہانگ کانگ میں ہے۔ اس کا نام "سی وائز میرین یونی ورسٹی" ہے۔

مرسلہ: عامر محمود، لاہور

کرسی سیڑھی بن جاتی ہے

مشہور سائنس دان بنجمن فرینکلن کی یاد میں امریکا میں جو لائبریری بنائی گئی ہے اُس میں ایک عجیب وغریب کرسی رکھی ہے۔ کرسی کی نشست (سیٹ) کو اُوپر اٹھانے سے کرسی سیڑھی میں بدل جاتی ہے۔ اس پر بیٹھے ہوئے شخص کو اگر اوپر کی الماری سے کسی کتاب کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ کرسی کو کھینچ کر جہاں تک ضرورت ہو اوپر لے جا سکتا ہے۔

مرسلہ: محمد علیم، کراچی

بولنے والی گھڑی

ایک مشہور گھڑی ساز ادارے نے ایک بولنے والی گھڑی تیار کی ہے، جس میں عام گھڑیوں کی طرح ڈائل اور سوئیاں نہیں ہیں، بلکہ اس کی سطح سپاٹ ہے۔ وقت معلوم کرنا ہو تو گھڑی کے اس حصّے کو اُنگلی سے چھُوا جائے چھوتے ہی یہ گھڑی اونچی آواز سے وقت بتا دیتی ہے۔ اس گھڑی کا نام "الباسٹرو وائس" رکھا گیا ہے۔

مرسلہ: مزمل امیر علی، کراچی۔

ایک عجیب و غریب ایجاد

رؤف پاریکھ

آپ نے اکثر کسی کو کہتے سنا ہوگا کہ انسان کی سب سے بڑی ایجاد پہیا ہے، لیکن پہیے کے علاوہ بھی انسان نے بعض نہایت حیرت انگیز ایجادیں کی ہیں۔ مثال کے طور پر زبان۔ زبان بھی ان عظیم ایجادوں میں سے ہے جن پر انسان جتنا فخر کرے کم ہے۔ اگر زبان نہ ہوتی تو ہم آپ باتیں کیسے کیا کرتے؟ اپنے خیالات تجربات، دُکھ سُکھ اور حالات ایک دوسرے کو کیسے بتاتے؟ زبان نہ ہوتی تو علم بھی نہ پھیلتا اور آپ یہ مضمون، یہ رسالہ بھی نہ پڑھ سکتے۔ پھر ہم میں اور جانوروں میں کیا فرق رہ جاتا؟

ہر علاقے اور نسل کے لوگوں نے اپنی زبان الگ بنائی۔ اگر دنیا کی چھوٹی بڑی تمام زبانوں اور بولیوں کا شمار کیا جائے تو ان کی تعداد لگ بھگ تین ہزار تک پہنچ جاتی ہے، لیکن بڑی بڑی زبانوں کی تعداد بمشکل دو سو ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ زبان کون ایجاد کرتا ہوگا؟ کوئی لفظ سب سے پہلے کس نے اور کب بولا ہوگا؟ اور دوسرے لوگوں نے اس کا مفہوم کیسے سمجھا ہوگا؟ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ سورۃ الرحمٰن میں ارشاد فرماتا ہے (ترجمہ) اللہ نے انسان کو بیان سکھایا (آیت ۴) سورہ علق میں ارشاد ہوتا ہے (ترجمہ) اللہ نے قلم سے علم سکھایا اور انسان کو وہ سکھایا جو انسان نہیں جانتا تھا۔ (آیت ۴، ۵) اِس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بیان کرنا یعنی باتیں کرنا اور علم سکھایا۔ سائنس دانوں اور علمِ لسانیات کے ماہرین نے زبان کی ابتدا کے بارے میں بعض دل چسپ نظریات قائم کیے ہیں، لیکن وہ اب تک کسی ایک نظریے پر متفق نہیں ہو سکے ہیں۔

کتنے تعجب کی بات ہے کہ زبان جیسی چیز اپنی بے شمار خوبیوں کے باوجود بے عیب اور خامیوں سے خالی نہیں۔ دنیا کی کسی بھی زبان کے بارے میں یہ دعوا نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خامیوں سے بالکل پاک ہے۔ کسی کی لکھائی بہت پیچیدہ ہے تو کسی کے قواعد انتہائی مشکل ہیں اور کسی میں بعض مخصوص آوازیں نہیں ہیں، مثلاً انگریزی زبان میں ت، ڑ، غ اور ق کی آوازیں نہیں ہیں۔ فارسی زبان میں ٹ، ڈ اور ڑ نہیں ہیں۔ عربی زبان میں ٹ، پ، چ، ڈ، اڑ اور گ کی آوازیں موجود نہیں۔ ہندی زبان میں ع اور ق نہیں ہوتے۔ (اس لحاظ سے) ہماری زبان اردو بہت وسیع ہے کہ اس میں بے شمار آوازیں ادا کرنے

اور لکھنے کی صلاحیت ہے) پھر ہر زبان کے اپنے اصول اور قواعد ہوتے ہیں جو دوسری زبانیں بولنے والوں کے لیے انتہائی عجیب اور بعض صورتوں میں مضحکہ خیز ہوتے ہیں، لیکن خود اسی زبان کے بولنے والوں کے لیے یہ اصول اور قواعد کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوتے۔

مثال کے طور پر انگریزی زبان کو لیجیے۔ ساری دنیا انگریزی قواعد (گرامر) کی پیچیدگیوں سے عاجز ہے، خصوصاً اس کے ہجّے کے قواعد اتنے عجیب و غریب ہیں کہ دوسری زبانیں بولنے والا جو فرد بھی اُسے سیکھتا ہے، سر پیٹ کر رہ جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ساری دنیا انگریزی سیکھتی ہے، مجبوراً یا شوقیہ۔ دراصل انگریز دنیا میں جہاں جہاں بھی گئے انھوں نے اپنی زبان کو پھیلایا اور اتنی ترقی کی کہ دوسروں کو اپنی زبان سیکھنے پر مجبور کر دیا۔ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم اپنی پیاری زبان اردو کو پھیلائیں اور اپنے ملک کو اتنی ترقی دیں کہ ساری دنیا کے لوگ اردو سیکھیں۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی انگریزی زبان میں ہجّے کے اصولوں کی۔ اس سلسلے میں ایک بہت دل چسپ بات خود انگریزی ہی کے ایک عظیم ادیب اور ڈراما نگار جارج برنارڈ شا نے لکھی ہے۔ (جارج برنارڈ شا ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔ انھیں ۱۹۲۵ء میں ادب کا نوبیل انعام بھی ملا تھا) انھوں نے لکھا کہ انگریزی لفظ فش (FISH) یعنی مچھلی کو اس طرح بھی لکھا جا سکتا ہے:

GHOTI

لوگ بہت حیران ہوئے کہ بھلا کہاں FISH اور کہاں GHOTI؟ لیکن انھوں نے دلیل یہ دی کہ انگریزی میں ف (F) کی آواز کے لیے کبھی کبھی جی ایچ (GH) کے حروف بھی لکھے جاتے ہیں۔ جیسے LAUGH (لاف بمعنی ہنسنا) اور ENOUGH (اِنَف = بمعنی کافی) میں۔ اسی طرح O (او) کبھی کبھی I (آئی) کی جگہ پر استعمال ہوتا ہے جیسے WOMEN (وِمن = بمعنی عورتیں) میں۔ اور TI (ٹی آئی) کے حروف ش (SH) کی بھی آواز دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر NATION (نیشن = یعنی قوم) کے لفظ میں TI (ٹی آئی) کے حروف دراصل SH (ایس ایچ) کی جگہ استعمال ہوئے ہیں۔ اسی طرح انگریزی میں GHOTI (گھوٹی) کو فش (FISH) پڑھا جا سکتا ہے۔

یہ مثال دینے سے اُن کی مراد یہ تھی کہ انگریزی میں ہجّے کے قواعد بہت اُوٹ پٹانگ اور غیر منطقی ہیں۔ انھیں ٹھیک کیا جانا چاہیے۔ واقعی زبان انسان کی بہت عجیب و غریب ایجاد ہے۔

تحفہ

اقوالِ زرّیں

مرسلہ: نصرت سلطانہ صدیقی، کراچی

- جانور انسان نہیں بن سکتا روپ بدلنے کی یہ فوقیت صرف انسان کو ہے۔
- اُلّو احمق نہیں، وہ اس وقت دیکھتا ہے جب تمام آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔
- گفت گو ختم کرنے کا وہ وقت بہترین ہوتا ہے جب دوسرا کچھ کہے بغیر ہاں میں سر ہلا رہا ہو۔
- ایک مرتبہ آنکھوں نے زبان سے پوچھا "تجھ کو ہر طرف سے دشمن گھیرے ہوئے ہیں اور دانتوں کی چھری ہر وقت تجھ پر تیز رہتی ہے تو اپنے بچاؤ کی کیا تدبیر کرتی ہے؟" زبان نے جواب دیا، "نرمی"۔

ناقابلِ فراموش

مرسلہ: خالد محمود، کراچی

ایک فرانسیسی برناڈین اپنی یادداشتوں میں جنگ کے زمانے کا ایک واقعہ لکھتا ہے، "ہم ہر روز اُجڑی ہوئی بستیوں سے گزرتے تھے۔ عورتیں، بچے اور مرد اپنے گھر بار چھوڑ کر ہمارے سامنے سے بھاگ جاتے۔ مسلح آدمی ہر جگہ کھیت اور باغات غارت کرتے اور اس فعل کو اپنی معراج سمجھتے۔ اسی ہنگامے میں ایک روز ہماری فوج کا ایک دستہ خوراک کی تلاش میں نکلا۔ راستے میں اُسے ایک جھونپڑا اور ایک اُجاڑ کھیت دکھائی دیا۔ چند سپاہیوں نے جھونپڑے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے ایک سفید داڑھی والا بوڑھا نکلا۔ کپتان نے اُس سے کہا، "بڈھے! ہمیں کسی اچھے غلّے والے کھیت میں لے چل۔" بوڑھا آگے بڑھا۔ آدھے گھنٹے بعد ایک نہایت عمدہ کھیت آیا، لیکن بوڑھا نہ رُکا، جلد ہی وہ ایک ہرے بھرے کھیت پر پہنچے۔ بوڑھے نے رُک کر انھیں غلّہ لینے کا اشارہ کیا۔

کپتان نے بوڑھے سے کہا، "پہلا کھیت بھی بہت اچھا تھا، تُو ہمیں بے کار یہاں لایا۔"

بوڑھے نے اطمینان سے جواب دیا، "آپ کا ارشاد درست ہے، لیکن بات یہ ہے کہ وہ کھیت کسی اور کا تھا، میرا نہیں تھا۔"

ٹانگوں کی لمبائی

مرسلہ: نفیہ احمد ترمذی۔ کراچی

صدر لنکن سے اُن کے کسی دوست نے باتوں باتوں میں پوچھا، "ایک اوسط قد کے آدمی کی ٹانگوں کی لمبائی کتنی ہونی چاہیے؟"

صدر لنکن بولے "کم از کم اتنی ضرور کہ ٹانگیں

زمین تک پہنچ سکیں۔"

لومڑی اور کوّا

مرسلہ: شاہد اقبال شاہد، کراچی

ایک کوّا روٹی کا ٹکڑا لیے ہوئے ایک درخت کی ٹہنی پر بیٹھا تھا۔ ایک لومڑی کا گزر اِدھر سے ہوا۔ منہ میں پانی بھر آیا۔ (لومڑی کے)۔ سوچا کہ کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ یہ اپنی چونچ کھول دے اور روٹی کا ٹکڑا میں جھپٹ لوں۔ پس اس نے مسکین صورت بنا کر اور منہ اوپر اُٹھا کر کہا، "کوّے میاں، سلام! تیرے حسن کی کیا تعریف کروں۔ کچھ کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے۔ واہ وا! چونچ بھی کالی، پر بھی کالے۔ آج کل تو دنیا کا مستقبل کالوں کے ہی ہاتھ میں ہے۔ اقلیم میں بھی بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے، لیکن خیر یہ سیاست کی باتیں ہیں۔ آمدم برسرِ مطلب۔ میں نے تیرے گانے کی تعریف سُنی ہے۔ تُو اتنا خوب صورت ہے تو گاتا بھی اچھا ہو گا۔ مجھے گانا سننے کا شوق یہاں کھینچ لایا ہے۔ ہاں تو ایک آدھ ٹھمری ہو جائے۔"

کوّا یہ سُن کر پھولا نہ سمایا، لیکن سیانے پن سے کام لیا۔ روٹی کا ٹکڑا منہ سے نکال کر پنجے میں تھاما اور لگا کائیں کائیں کرنے۔

بی لومڑی کا کام نہ بنا تو یہ کہتی ہوئی چل دی، "بہت تیرے کی۔ بے سُرا بھانڈ۔ معلوم ہوتا ہے تو نے بھی حکایاتِ لقمان پڑھ رکھی ہے۔"

—— ابنِ انشا

جبری بھرتی

مرسلہ: سید امین الدین، اسلام آباد

جرمنی میں فوج کے جبری بھرتی کے دوران دو دوستوں نے سوچا کہ اگر وہ اپنے سارے دانت نکلوا دیں تو انھیں فوج کی بھرتی سے نجات مل جائے گی۔ بس منصوبے پر عمل کر کے جب وہ متعلقہ دفتر میں پہنچے تو قطار میں ان دونوں کے درمیان ایک موٹا تازہ شخص، جس کی ناک بُری طرح بہ رہی تھی آ کر کھڑا ہو گیا۔ انٹرویو کے وقت پہلا دوست افسر کے سامنے پہنچا اور بتایا کہ اس کے منہ میں ایک بھی دانت نہیں ہے، اس لیے وہ فوج میں خدمات انجام نہیں دے سکے گا۔

افسر نے اس کے منہ میں انگلی ڈال کر خوب اچھی طرح مسوڑوں کا جائزہ لیا اور بولا، "ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو۔"

اس کے بعد موٹے شخص کی باری آئی اس نے کہا کہ میں دائمی نزلے کا شکار رہتا ہوں اس لیے مجھے فوج میں شامل نہ کیا جائے۔ افسر نے حسبِ معمول اس کی بہتی ہوئی ناک کے دونوں نتھنوں میں انگلی ڈال کر اچھی طرح ناک کو دیکھا اور بولا، "ٹھیک ہے تم بھی جا سکتے ہو۔"

موٹا شخص چلا گیا تو دوسرے دانت نکلوانے والے شخص کا نمبر آ گیا۔ افسر نے پوچھا، "کیوں، تمھیں کیا شکایت ہے؟"

دوسرے شخص نے افسر کی ناک میں لٹھڑی ہوئی

انگلی کی طرف دیکھا اور گھبرا کر جلدی سے انکار میں سر ہلاتا ہوا بولا، "نہیں جناب! مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

کس چیز میں کیا ہے؟

مرسلہ: سعید احمد خاں، کراچی

وٹامن اے : گھی، مچھلی کا تیل، انڈا، مکھن اور گاجر۔
وٹامن سی : ترش پھلوں اور سبزیوں میں۔
وٹامن ڈی : مچھلی کے تیل میں۔
کاربوہائڈریٹ : گیہوں، چاول، مکئی میں۔
پروٹین : گوشت، دال، مچھلی اور انڈے میں۔
وٹامن ای : گیہوں کے چھلکوں میں۔
میگنیشم : انجیر، پالک، انگور، سیب اور ٹماٹر میں۔
گندھک : مولی، لہسن، پیاز، بند گوبھی، پھول گوبھی میں۔
فولاد : دال، مولی، ہری سبزیاں، پالک، مٹر، سیم، گاجر، کدو، بند گوبھی، گوشت، سیب، کیلا، انجیر، بادام، سویابین اور کلیجی میں۔

باقی صفحہ فلاں پر

مرسلہ: نعمان شاہ تیموری، کراچی

رومانی افسانے تو ایک طرف، علمی مضامین اور ڈراؤنی کہانیاں بھی اس "دیکھیے صفحہ فلاں" کی دست بُرد سے نہیں بچتیں۔ مثال کے طور پر سراغ رسانی کے اس افسانے کو لیجیے:

"..... بالکل اندھیری رات تھی۔ بارش نے سوچ رکھا تھا کہ بس آج ہی برسوں گی۔ قبرستان کا منظر تھا اور ہوا کے تھپیڑے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بہت بڑی مصیبت ٹوٹنے والی ہے۔"

یہ پڑھ کر دل پر تھوڑا سا خوف ضرور طاری ہوتے لگتا ہے۔ خصوصاً اگر اندھیری رات میں افسانہ پڑھا جائے اور ساتھ ساتھ بارش بھی ہو رہی ہو:

"تیز بارش میں ملزم سرپٹ بھاگا۔ اس کے پیچھے پیچھے کانسٹیبل تھا۔ اس قسم کے تعاقب کا اتفاق کانسٹیبل کو کبھی نہیں ہوا تھا۔ ملزم کے پاؤں میں گویا پہیے لگے ہوئے تھے۔ کانسٹیبل نے چلّا کر کہا، "تو بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ میں سیٹی بجاتا ہوں۔ ابھی کئی سپاہی تجھے گھیر لیں گے۔"

لیکن ملزم پہ کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے قلانچ بھری برساتی نالے کو پھلانگ گیا اور لپک کر سامنے کی اونچی دیوار پہ چڑھ گیا۔ بھاری بھرکم کانسٹیبل پھاند نہ سکا اور وہیں رُک گیا۔ ملزم نے قہقہہ لگایا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے چلّا کر بولا کہ....

باقی دیکھیے صفحہ فلاں پر

دل پر بہ دستور ڈر حاوی ہے۔ صفحہ تلاش کرتے وقت آخری فقروں کو دہرایا جا رہا ہے۔ بقیہ حصہ مل جاتا ہے۔ آخری فقرہ پڑھا جاتا ہے.... ہاں تو.... ملزم نے قہقہہ لگایا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے چلّا کر بولا

کہ "خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجیے"۔ یہ کیا تماشا ہے؟ کہاں تو سمجھے بیٹھے تھے اور کہاں کچھ ہنسی آجاتی ہے۔ ملزم کانسٹیبل سے کہہ رہا ہے کہ نمبر خریداری کا حوالہ دیجیے۔

دوبارہ دیکھتے ہیں کہ کہیں غلط تو نہیں پڑھ لیا۔ خاصی چھان بین کے بعد پتا چلتا ہے کہ واقعی کچھ اور پڑھ لیا ہے۔ اب جو افسانے کو پڑھتے ہیں تو وہ ملزم کا پُر لطف فقرہ بھولتا ہی نہیں۔ ہنسی ہے کہ زبردستی آرہی ہے۔ بس افسانہ ختم۔

—— شفیق الرحمٰن

فارسی کہاوتیں

مرسلہ: سیّد رضا علی عابدی، کراچی

جب تمھارے دشمن تمھارے قدم چومے اور تمھاری خوشامد کرے تو اس کے قدم چومنے پر نہ جاؤ، کیوں کہ دریا جب کسی دیوار کو گرانا چاہتا ہے تو پہلے اس کے قدم چومتا ہے۔

جب تمھارا دشمن تمھارے آگے جھکے تو اس کے جھکنے پر نہ جاؤ، کیوں کہ کمان جتنی ٹیڑھی ہوتی ہے تیر اتنی ہی تیزی سے نکلتا ہے۔

میری طرح جھوٹ

مرسلہ: سیّد واثق حسین

ایک دن جارج برنارڈ شا پیرس سے انگلستان آرہا تھا۔ راستے میں اس کی ایک مشہور ادیبہ سے ملاقات ہوئی۔ دونوں پہلے کبھی نہیں ملے تھے، اس لیے رسمی طور پر تعارف ہوا۔ یہ ادیبہ برنارڈ شا کی حاضر جوابی کے چرچے سُن چکی تھی، اس لیے اسے نیچا دکھانے کی کوشش کرنے لگی۔ شا نے کہا، آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔

ادیبہ نے مسکرا کر کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ میں یہی جملہ آپ کی شان میں نہیں دہرا سکتی۔

شا نے برجستہ جواب دیا، "کیا کسی کو خوش کرنے کے لیے میری طرح آپ ایک آدھ جملہ بھی جھوٹ نہیں بول سکتیں؟"

بھونکنے والے کتّے

مرسلہ: محمد سلیم خیر الدین، اسلام آباد۔

انسانی زندگی میں تکلیف اور مصائب ایک بھونکنے والے کتّے کے مانند ہیں۔ اگر آپ اس کی طرف متوجہ ہوں گے یا خوف زدہ ہو کر بھاگنے کی کوشش کریں گے تو وہ مزید بھونکے گا اور کاٹنے کے لیے دوڑے گا، لیکن اگر آپ اس کے بھونکنے کی پروا کیے بغیر بے نیازی کے ساتھ اپنے راستے پر چلتے جائیں گے تو وہ بھونک کر خاموش ہو جائے گا۔ مصائب سے خوف زدہ ہو کر بھاگنے کے بجائے ان کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتے جائیے مصائب آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

نونہال مصوّر

مدثر اقبال پنوار راجپوت

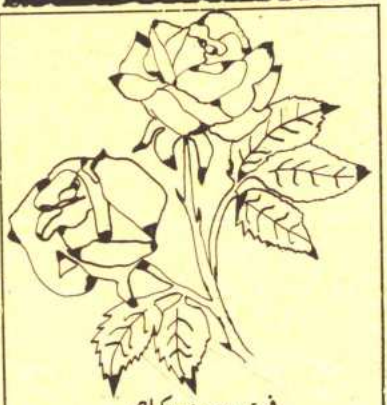

فوزیہ پروین، کراچی

عزالہ شاہین، فیصل آباد

محمد طارق آفتاب، کراچی

سلسلہ وار ناول
ٹکڑا نمبر ۳

وارث کی تلاش

مناظر صدیقی

مٹو کو گھر پہنچانے کے بعد طارق کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ اسکول میں تو یوں بھی چھٹیاں تھیں۔ ابّو کے کمرے اور باغ کی صفائی تو صبح ہی ہو چکی تھی۔ صرف مرغیوں کو دانہ ڈالنے اور ان کے ڈربوں کی صفائی باقی رہ گئی تھی۔ یہ زیادہ دیر کا کام نہیں تھا۔ طارق کو بڑی جلدی اس کام سے فرصت ہو گئی۔ اس نے منھ ہاتھ دھو کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ امّی اُسے مرغیوں کو دانہ ڈالتے دیکھ ہی چکی تھیں۔ انھوں نے خود ہی کہا کہ طارق شام پانچ چھے بجے تک اپنے نئے دوست کے ساتھ وقت گزار سکتا ہے۔

امی سے اجازت ملتے ہی طارق، حبیب کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔ حبیب بھی اپنے اتالیق سے پک نک منانے کی اجازت لے چکا تھا۔ طارق پہنچا تو وہ بالکل تیار تھا۔ دونوں نے سہ پہر کے ناشتے کے بہانے کھانے پینے کی کچھ چیزیں ساتھ لیں اور پرانی حویلی کی طرف چل دیے۔ کھانے کی چیزوں میں پھل، سموسے، نمک پارے، مٹھن لگے ہوئے توس شامل تھے۔ حبیب کے ملازموں نے یہ سب چیزیں اتنی زیادہ دے دی تھیں کہ دو کے بجائے چار لڑکے بھی کھاتے تو بھی بہت کچھ بچ رہتا۔

راستے میں طارق نے حبیب کو بتایا کہ اسے گھوڑوں پر سواری کرنے کا بہت شوق ہے۔ اس کی امّی نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آئندہ سال اسے گھوڑا دلا دیں گی، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ گھوڑے پر سواری کرنا سیکھ لے اور اپنا پورا جیب خرچ بچا کر کچھ پیسے امّی کو دے۔ باقی پیسے امّی مِلا دیں گی۔ اب اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ گھڑ سواری کس سے سیکھے۔

"یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔ ہمارے گھوڑوں کا نگراں پربل تمھیں گھوڑے پر سواری کرنا سکھا سکتا ہے۔ وہ بہت اچھا شہ سوار بھی ہے اور بہت بھلا آدمی ہے۔ بچّوں سے تو اسے بہت محبت ہے۔" حبیب نے کہا۔

"لیکن مجھے وہ کیوں سکھانے لگا؟" طارق نے مایوسی ظاہر کی۔

"واہ! یہ بھی کوئی بات ہے۔ میں پریل سے کہوں گا تو وہ انکار نہیں کرے گا اور میں کل ہی اس سے کہہ دوں گا۔" حبیب نے وعدہ کیا۔

حبیب کے وعدے سے طارق کا ایک بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اب اُسے اطمینان ہو گیا تھا کہ ایک سال کے بعد اسے گھوڑا مل ہی جائے گا۔ وہ گھوڑے کے تصور میں مگن تھا۔ اُسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ کب پرانی حویلی تک پہنچے۔ وہ تو اس وقت چونکا تھا جب حبیب نے اسے جھنجھوڑا۔ بات یہ تھی کہ ایک پیلے رنگ کا کتا حبیب کی طرف لپکا تھا۔ اگر حبیب ذرا سا بھی چوک جاتا تو کتا اسے کاٹ ہی لیتا۔ عین وقت پر حبیب اچھل کر الگ ہٹا تھا۔ کتے سے بچنے کی کوشش میں وہ طارق سے ٹکرایا تھا۔ کتا اپنے زور میں آگے نکل گیا تھا، لیکن اب وہ پلٹ کر ان پر حملہ کرنا چاہتا تھا، لیکن اسی وقت طارق کو زمین پر پڑی ہوئی ایک لکڑی نظر آ گئی۔ یہ شاید کسی درخت کی ٹوٹی ہوئی ڈالی تھی۔ یہ خاصی لمبی اور مضبوط تھی۔ طارق نے فوراً وہ لکڑی اُٹھا لی۔ کتا جیسے ہی قریب آیا

طارق نے پوری قوّت سے وہ لکڑی کتّے کو مار دی۔ کتّے کے لیے پہلی چوٹ ہی کارگر ثابت ہوئی تھی، لیکن طارق نے بڑی پھرتی سے دو تین لکڑیاں اور رسید کر دیں اور کتّا چیختا ہوا دُم دبا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

"شاید یہ پاگل کتّا تھا۔" حبیب نے کہا۔

"نہیں، پاگل نہیں تھا۔" حبیب نے کہا، "میں نے سُنا ہے کہ پاگل کتّے بالکل سیدھے بھاگتے ہیں، وہ مُڑ مُڑ کر اور پلٹ پلٹ کر حملے نہیں کرتے اور یہ کتّا تو پلٹ پلٹ کر ہم پر حملے کر رہا تھا اس لیے یہ پاگل نہیں ہو سکتا۔ بس جنگل کا کوئی آوارہ کتّا تھا۔"

تھوڑی دیر بعد وہ جمیل کے سامنے بیٹھے تھے۔ طارق اور حبیب کی لائی ہوئی کھانے کی چیزیں جمیل کے لیے نعمت ثابت ہوئیں۔ دونوں دوستوں نے جمیل کا تھوڑا بہت ساتھ دیا، لیکن زیادہ نہیں کھایا، کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ دوسرے دن تک جمیل کو کھانے کے معاملے میں کوئی فکر نہ ہو۔ کھانے سے فارغ ہو کر جب وہ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے تو طارق نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ خدا داد خاں صاحب نے بڑی دولت جمع کر رکھی ہے اور وہ تمام دولت اسی حویلی میں کہیں چھپی ہوئی ہے۔ اسے آج صبح ہی ایّوب سے معلوم ہوا تھا کہ ہسپتال میں خان صاحب کو ابھی تک ہوش نہیں آیا ہے۔ ڈاکٹروں کو ان کے زندہ بچنے کی امید بہت کم ہے۔ پھر طارق نے جمیل سے کہا:

"جمیل اگر خاں صاحب کو ہوش نہیں آیا اور وہ بے ہوشی کی حالت میں ہی مر گئے تو وہ تمام دولت جو انھوں نے جمع کی ہے ضائع ہو جائے گی، کیوں کہ کسی کو یہ معلوم ہی نہیں ہو گا کہ وہ دولت کہاں چھپی ہوئی ہے۔ تمھیں بھی اس دولت کے متعلق کچھ نہیں معلوم۔ حال آنکہ اس دولت کے مالک تم ہی ہو۔"

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس دولت کا وارث میں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ تایا نے کوئی وصیت کر رکھی ہو اور وہ کسی دوسرے آدمی کو اس دولت کا وارث بنا چکے ہوں۔"

"خاں صاحب دنیا میں کسی سے میل جول ہی نہیں رکھتے پھر وہ کسی اور کے نام اپنی دولت کیوں کرنے لگے؟" طارق نے کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی دولت اور جائداد کسی مسجد کے نام کر دی ہو

یا کسی یتیم خانے کو دے دی ہو۔" حبیب نے کہا۔

"نہیں، میں نے انھیں کبھی مسجد کی طرف جاتے یا عبادت کرتے نہیں دیکھا، اس لیے وہ اپنی دولت کسی مسجد کو نہیں دے سکتے۔" طارق نے کہا۔

"چلو تھوڑی دیر کے لیے مان لیتے ہیں، لیکن دولت کے متعلق تو ہمیں معلوم ہی نہیں کہاں چھپی ہے۔ اس لیے اگر میں ہی اس دولت کا وارث بھی ہوں تو مجھے اس سے کیا فائدہ پہنچے گا۔"

"یہی تو میں بھی کہتا ہوں کہ اس دولت کے وارث تم ہی ہو اس لیے تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ دولت کہاں ہے۔" طارق نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا، "اور یہ جاننے کے لیے کہ دولت کہاں چھپی ہوئی ہے ہمیں گھر کی اچھی طرح تلاشی لینی ہو گی۔"

"لیکن اتنی بڑی حویلی میں دولت کہاں تلاش کی جائے گی۔" حبیب نے کہا۔

"اوپر کی منزل پر جانے کے راستے میں بھی تالا پڑا ہے۔" جمیل نے بتایا۔

"ہو سکتا ہے کہ دولت اوپر ہی کی منزل میں کہیں چھپی ہوئی ہو۔" حبیب نے کہا۔

"نہیں، دولت اوپر نہیں ہو گی۔ اوپر کی منزل بند رہتی ہے۔ کوئی بھی چور باہر کی طرف سے کسی طرح اوپر چڑھ سکتا ہے۔ خود خان صاحب کو بھی چور کے اوپر جانے کا پتا نہیں چل سکتا۔ پھر کوئی بھی کنجوس شخص اپنی دولت کسی ایسی جگہ نہیں چھپا سکتا جہاں سے وہ ہر وقت اس کی نگرانی نہ کر سکے۔ اس لیے دولت نچلی منزل ہی میں ہو گی بلکہ سونے کے کمرے ہی میں ہو گی کیونکہ اسی طرح خان صاحب اپنی دولت کی نگرانی اور حفاظت کر سکتے تھے۔" طارق نے سمجھایا۔

"لیکن میں نے تو آج اس کمرے کی صفائی بھی کی۔ ان کی میز بھی سجائی اس میں ایک دراز کے سوا باقی سب درازیں کھلی ہیں۔ ان میں سے کسی میں بھی کوئی رقم نہیں۔ میں نے تایا کا بستر بھی جھاڑا تھا۔ اس کے نیچے بھی مجھے دولت نہیں ملی۔" جمیل نے بتایا۔

"کنجوسوں کی دولت کبھی ایسی جگہ نہیں ہوتی جہاں وہ ہر کسی کو آسانی سے مل جائے۔" طارق نے طنزیہ انداز سے کہا۔

"تم تو پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔" حبیب جھنجھلا گیا، "کبھی کہتے ہو کہ اسی کمرے میں دولت

ہو گی اور جب جمیل نے بتایا کہ آج صبح ہی ہر چیز کی صفائی اس نے اپنے ہاتھوں سے کی ہے تو اب کہتے ہو کہ وہ ایسی جگہ نہیں ہو گی جہاں وہ ہر کسی کو آسانی سے نظر آجائے۔"

"میری دونوں باتیں غلط نہیں تھیں۔" طارق نے کچھ کچھ ناراضگی سے کہا۔ پھر اس نے کچھ سوچتے ہوئے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ "دیکھو دولت ہو گی تو اسی کمرے میں لیکن میز کی درازوں یا بستر کے نیچے نہیں ہو سکتی۔ وہ کسی ایسی جگہ ہو سکتی ہے جہاں پر عام طور پر کوئی توجہ نہ دے۔" پھر اس نے کچھ سوچتے اور چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مثلاً یہ پرانے اخباروں کا ڈھیر دیکھ رہے ہو نا! یہ کئی من ہیں۔ نہ جانے کب سے جمع ہو رہے ہیں۔ کوئی بھی شخص یہ نہیں سوچ سکتا کہ ان پرانے اور ردّی اخباروں کے درمیان کوئی خزانہ بھی ہو گا۔ کوئی چور ان اخبارات کو اپنی جگہ سے ہٹانے اور ایک ایک ورق اُلٹ کر دیکھنے میں اپنا وقت برباد نہیں کرے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر خاں صاحب واقعی کنجوس ہیں اور انھوں نے دولت جمع کر رکھی ہے تو ہمیں ان ردّی اخبارات سے ہی تلاش شروع کرنی چاہیے۔" طارق نے اپنا فیصلہ سُنایا۔

"ان میں تو منوں مٹّی ہو گی۔ ان میں تم ہی اپنا سر کھپاؤ۔" جمیل نے کہا۔

"مجھے منظور ہے۔" طارق نے کہا۔ "لیکن تم الماریوں، کھونٹیوں پر ٹنگے ہوئے پرانے کپڑوں اور دیوار پر لگی ہوئی بڑی تصویروں کے پیچھے تلاش کرنے کی کوشش کرو۔"

پھر تینوں دوست اپنے اپنے کام میں جٹ گئے۔ حبیب اور جمیل کا کام تو جلد ہی ختم ہو گیا اور وہ دونوں ایک طرف آرام سے بیٹھ گئے۔ انھیں تو کہیں بھی دولت نہیں ملی تھی۔ طارق کا کام ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ گرد اور مٹّی کی پروا کیے بغیر ایک ایک اخبار نکال رہا تھا اور ان کی تہیں بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ کافی دیر کی محنت کے بعد وہ اچانک چیخ پڑا۔ یہ خوشی کی چیخ تھی۔ جیسے اُسے خزانہ مل گیا ہو۔ اس کے ہاتھ میں پیتل کی ایک چابی تھی۔

"یہ دیکھو یہ چابی ایک اخبار کے بیچ میں رکھی تھی۔ یہ یقیناً کوئی اہم چابی ہے۔" طارق نے خوشی خوشی کہا۔

"لیکن یہ تو کسی بڑی الماری یا بڑے دروازے کی چابی معلوم ہوتی ہے۔" جمیل نے کہا۔

"نچلی منزل کے تمام کمرے میرے دیکھے ہوئے ہیں۔ ان میں تو کوئی کمرا ایسا نہیں جو بند ہو۔ ہاں، دو ایک کمروں میں الماریاں ضرور ہیں۔"

"ایسا کرو کہ تم دونوں اس چابی کو آزماؤ۔ شاید کوئی الماری کھل جائے اور اسی الماری میں

خاں صاحب کی دولت جمع ہو۔ اتنی دیر میں باقی اخبارات بھی دیکھتا ہوں۔ شاید کوئی اور کام کی چیز مل جائے۔" طارق نے مشورہ دیا۔ حبیب اور جمیل نے کوئی بحث کیے بغیر طارق کی بات مان لی۔ دونوں کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ طارق اُن سے زیادہ عقل مند ہے۔ اسی لیے دونوں نے اس بار اس سے بحث نہیں کی۔

حبیب اور جمیل کے جانے کے بعد طارق دوبارہ ردّی اخبارات صاف کرنے اور ان کی تلاشی لینے میں مصروف ہو گیا۔ اس کام میں اس کا خاصا وقت گزر گیا۔ تھوڑی دیر بعد حبیب اور جمیل واپس آ گئے۔ انھوں نے بتایا کہ چابی کسی الماری میں نہیں لگی۔ طارق نے اپنا کام کرتے ہوئے

ان سے کہا کہ وہ اوپر کی منزل تک جانے والے راستے کے دروازے میں بھی اسے لگا کر دیکھیں شاید وہ دروازہ کھل جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اوپر کی منزل میں کوئی اور ایسی چیز ہو جس سے چھپی ہوئی رقم کی جگہ کے متعلق کوئی اندازہ لگایا جا سکے۔ جمیل اوپر کی منزل نہیں کھولنا چاہتا تھا کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ خاں صاحب جلد ہی صحت یاب ہو کر لوٹ آئیں گے اور وہ اس وقت یہ دیکھ کر بہت ناراض ہوں گے کہ ان کی غیر موجودگی میں اس نے پورے گھر کی تلاشی لے لی ہے، لیکن جب طارق نے یہ سمجھایا کہ اگر انھیں جمع کی ہوئی رقم مل گئی تو وہ اسے ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔ خان صاحب کو یہ پتا ہی نہیں چلے گا کہ پورے مکان کی تلاشی لی گئی ہے، البتہ خدانخواستہ خاں صاحب صحت یاب نہ ہوئے تو اُس وقت جمیل کو رُپے پیسے کے معاملے میں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ اس وقت خاں صاحب کی جمع کی ہوئی دولت تلاش کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ جمیل لوٹ کر اپنے سوتیلے باپ کے پاس نہیں جانا چاہتا۔ اگر اس وقت اس دولت کا پتا نہ چلا اور خدانخواستہ خاں صاحب صحت یاب نہ ہوئے تو جمیل ہی کو پریشانی اُٹھانی پڑے گی۔ یہ بات جمیل کی سمجھ میں آ گئی اور اوپر جانے والے راستے کے بند دروازے کو کھولنے کی کوشش کرنے چلا گیا۔

جمیل اور حبیب واپس لوٹے تو ان کے چہروں سے مایوسی صاف ظاہر تھی، لیکن طارق کی آنکھ میں چمک تھی۔ ان کی واپسی تک وہ تمام اخبارات دوبارہ اپنی جگہ رکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کی پیٹھ کی طرف تھے۔ حبیب اور جمیل کے مایوس چہرے دیکھ کر اس نے کہا:

"میرے خیال سے زینے کے دروازے میں بھی یہ چابی کار آمد ثابت نہیں ہوئی۔"

"ہاں!" حبیب اور جمیل نے ایک ساتھ مختصر سا جواب دیا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔" طارق نے کہا، "مجھے تو اپنی کوشش میں ایک اور کام یابی ہو ہی گئی ہے۔" طارق نے ایک لفافہ جمیل اور حبیب کو دکھایا۔ یہ لفافہ بند تھا اور اس پر ایک طرف موٹے موٹے حروف میں "وصیت نامہ" لکھا تھا۔

جمیل اور حبیب تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے طارق کے پاس آ گئے۔

"یہ تمھیں کہاں ملا؟" جمیل نے پوچھا۔

"انھی اخبارات میں سے ایک اخبار کے بیچ میں رکھا ہوا تھا۔ اسے ایک اور اخبار میں لپیٹ کر بڑی احتیاط سے رکھا گیا تھا۔" طارق نے بتایا۔

"لیکن اس پر تو لاکھ کی مہر لگی ہے۔" جمیل نے ہاتھ سے لفافہ لیتے ہوئے کہا۔

طارق نے کہا، "تم اس کی فکر نہ کرو۔ لاکھ پرانی ہو چکی ہے۔ اسے توڑ کر نکالا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی لاکھ توڑنے کی کیا ضرورت ہے تم لفافہ پھاڑ لو۔"

جمیل نے کہا، "میں اسے اس طرح کھولنا چاہتا ہوں کہ اسے دوبارہ اسی طرح بند کیا جا سکے۔"

"لاؤ میں کوشش کرتا ہوں۔" حبیب نے جمیل کے ہاتھ سے لفافہ لیتے ہوئے کہا۔ پھر تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ لاکھ کی مہر توڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اس نے بڑی احتیاط سے لفافہ کھولا۔ اندر سے جو وصیت نامہ نکلا اس میں لکھا تھا کہ خداداد خاں صاحب نے اپنی تمام زمین، اپنی حویلی، اپنی شہر کی جائداد اور پانچ لاکھ روپے نقد جمیل کے نام کر دی ہے، کیوں کہ وہ ان کا اکلوتا بھتیجا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ یہ تمام دولت اُسے اس وقت ملے گی جب اس کی عمر اکیس سال ہو جائے گی۔ وصیت نامے میں یہ بھی لکھا تھا کہ اصل وصیت نامہ خاں صاحب کے وکیل کے پاس کراچی میں محفوظ ہے، لیکن اس میں نہ تو وکیل کا نام اور پتا لکھا تھا نہ یہ لکھا تھا کہ نقد رقم کہاں رکھی ہے، البتہ یہ ضرور لکھا تھا کہ حویلی میں ان کی جو نقد رقم موجود ہے، وہ ان کے مرتے ہی جمیل کو مل سکتی ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ یہ رقم حویلی میں کہاں ہے۔

"اب اس دولت کا میں کیا کروں جو مجھے کم سے کم چھ سال بعد ملے گی جب کہ مجھے اس کی ضرورت اب ہے۔" جمیل نے کہا۔

"لیکن جو رقم تو تم کو تمھارے تایا کے مرتے ہی مل سکتی ہے جو حویلی میں موجود ہے۔" طارق نے کہا۔

جمیل نے کہا، "خدا کرے کہ تایا زندہ رہیں، لیکن خدانخواستہ ایسا نہیں ہوا تو بھی حویلی میں رکھی ہوئی رقم بھی میرے کام نہیں آسکے گی، کیوں کہ مجھے یہ معلوم ہی نہیں کہ وہ کہاں رکھی ہے۔"

"تمھیں ہمّت نہیں ہارنی چاہیے۔" طارق نے اُسے سمجھایا، "ابھی تو تمھارے تایا زندہ ہیں اور ہسپتال میں ان کا علاج ہو رہا ہے۔ فی الحال کوئی خطرے کی بات نہیں۔ اتنے دن میں ہم کوشش

کریں گے کہ اس رقم کا پتا چلائیں۔"

"مجھے تو کام یابی کی کوئی امید نہیں۔ آخر آج ہم نے اسے کتنا تلاش کیا ہے؟"

"میں نے کہا نا، ہمّت نہیں ہارنی چاہیے۔ آج تو خیر بہت دیر ہو گئی ہے۔ ہم کل سے اسے دوبارہ تلاش کریں گے۔" طارق نے کہا۔

"ہاں، اب ہمیں چلنا چاہیے۔ خاصی دیر ہو گئی ہے۔ گھر پر لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔" حبیب نے کہا۔

"اچھی بات ہے۔" جمیل نے بجھے ہوئے دل سے کہا اور دونوں دوست دوسرے دن ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیثِ نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے، لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہوں اُن کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

سارے بچّوں کی پہلی پسند!

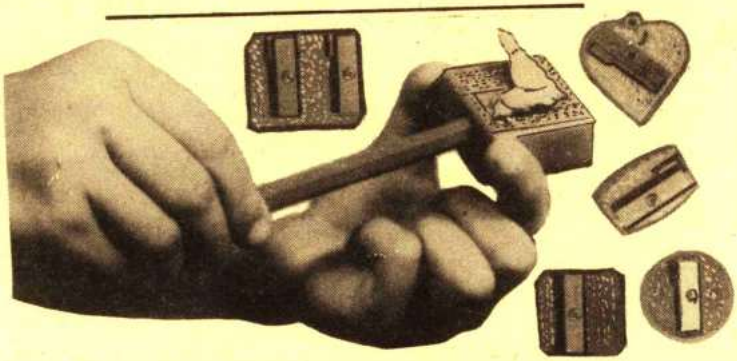

گارنٹی کے ساتھ پینسل کی نوک نہیں ٹوٹتے

انڈس شارپنر

معلومات عامہ ۲۴۷

اس بار متفرق معلومات کے بجائے اردو کے چند مشہور ادیبوں اور شاعروں کی پیدائش کے سال دیے جا رہے ہیں، آپ ان کے انتقال کے سال بتا دیجیے۔

اس بار بھی سوالات کی تعداد بارہ ہی ہے، لیکن تصویریں صرف ۱۲ یا ۱۱ صحیح جوابات بھیجنے والوں کی شائع کی جائیں گی دس اور نو صحیح جوابات بھیجنے والوں کے صرف نام شائع کیے جائیں گے۔ جوابات ۱۵ نومبر تک بھیج دیجیے۔ جوابات کے نیچے اپنا صاف نام اور پورا پتا لکھیے۔

۱۔ اردو کے عظیم ترین شاعر اسد اللہ خاں غالب ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔
۲۔ اردو کے ممتاز شاعر اور نقاد خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔
۳۔ فیض احمد فیض ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے۔
۴۔ مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے۔
۵۔ سر سید احمد خاں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔
۶۔ پریم چند ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔
۷۔ علامہ شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔
۸۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔
۹۔ مولانا عبدالحلیم شرر ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔
۱۰۔ شوکت تھانوی ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔
۱۱۔ جگر مرادآبادی ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔
۱۲۔ احمد شاہ پطرس بخاری ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔

HMD/HNY-1/85 ADARTS

صحت مند نونہال

یاسمین شیخ، حیدر آباد

یاسر مقصود گل، رتو ڈیرو

افشاں سلیم، کیمبل پور

تنزیل احمد، کراچی

حافظ محمد اکرم سیال، شیخ پورہ

رزاق رمضان

شازیہ منوّر، کراچی

مسرور احمد، شاہ پور چاکر

اشرف علی سولجر، کراچی

عمران الرحمٰن، کوئٹہ

محمد بخش بلوچ، ملیر

سید محمد طارق شاہ، شہداد پور

محمد عارف نسیم، شاہ پور چاکر

شعور احمد، لطیف آباد

■ ایک چیونٹی نے ہاتھی سے کہا، "دیکھیے ہاتھی صاحب، یہ مساوات کا زمانہ ہے۔ آپ کو بھی اس قدر خوراک استعمال کرنی چاہیے جتنی میں کرتی ہوں۔"

ہاتھی نے کہا، "محترمہ! مساوات سے کس کو انکار ہے۔ بہرحال میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جس قدر خوراک مجھے میسّر آتی ہے اسی قدر آپ کو بھی ملنی چاہیے۔

مرسلہ: کامران نذیر، سکھر

■ امریکا میں ایک قاتل کو بجلی کی کرسی کے ذریعہ سے سزائے موت دی جانے والی تھی۔ اسے کرسی پر بٹھایا جا چکا تو جلاد نے پوچھا،

"تمھاری آخری خواہش کیا ہے؟"

قاتل نے جواب دیا، "بس میرا ہاتھ پکڑے رکھو، اس طرح مجھے سہارا رہے گا۔"

مرسلہ: مینا ولی، راولپنڈی

■ بیوی: (شوہر سے) "دیکھیے میں سرخ ساری میں کیسی لگ رہی ہوں؟"

شوہر نے بیوی کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی آہ بھرتا ہوا بولا، "ایسا لگتا ہے جیسے کوئلے کی کان میں آگ لگ گئی ہو۔"

■ پہلا: "کیا یہ سچ ہے کہ موسیقی سے پانی کھول سکتا ہے؟"

دوسرا: "سچ ہی ہوگا بھئی، خون کھولتا ہوا تو ہم نے بھی محسوس کیا ہے۔"

■ ایک شخص (دوسرے سے) "جب میں نے سگرٹ پینا چھوڑا تو شروع میں بہت تکلیف ہوئی، لیکن چوتھے دن بڑا سکون محسوس ہوا۔" دوسرا: "وہ کیسے؟"

پہلا: چوتھے دن میں دوبارہ سگرٹ پینا شروع کر چکا تھا۔

مرسلہ: ساجد محمود، کراچی

■ ماں: "بیٹا، تم اسکول جانا پسند کرتے ہو؟"

بچہ: جی امّی، جانا بھی اور آنا بھی، لیکن ٹھہرنا نہیں۔"

مرسلہ: رضوان محمد شریف، کراچی

■ ایک صاحب مرنے لگے تو ان سے ان کی آخری

خواہش پوچھی گئی تو انھوں نے کہا، "بس اتنا کرنا کہ جب میری تحریر نونہال میں چھپ جائے تو میری قبر پر آکر بتا دینا۔"

■ پہلا دوست: تمھیں ٹی وی پر کون سا پروگرام اچھا لگتا ہے؟"

دوسرا دوست: انتظار فرمائیے

پہلا دوست: "یہ تو کوئی مستقل پروگرام نہیں ہے پھر تمھیں کیوں پسند ہے؟"

دوسرا دوست: وہ اس لیے کہ جب ٹی وی پر انتظار فرمائیے آتا ہے تو میں اپنے ضروری کام کر لیتا ہوں مثلاً بازار سے ضروری چیزیں لے آتا ہوں، نہا لیتا ہوں، کھانا کھا لیتا ہوں۔"

مرسلہ: منصورہ قریشی، سکھر

■ ایک نوجوان سیلز مین نے ایک تجربہ کار سیلز مین سے کہا کہ آج کا دن بہت خراب گزرا۔ جہاں بھی میں آرڈر کے لیے گیا صرف بے عزّتی ہاتھ لگی۔" تجربہ کار سیلز مین بولا، "عجیب بات ہے! آرڈر حاصل کرنے کے سلسلے میں مجھے بھی طرح طرح کے تجربے ہوئے۔ مجھے ڈانٹا ڈپٹا بھی گیا، کبھی کبھی زینے سے ڈھکیلا اور دروازے سے باہر پھینکا بھی گیا ہے، لیکن بے عزّتی کا سامنا مجھے کبھی نہیں کرنا پڑا۔"

■ ایک کسان بینک میں آیا اور دو ہزار رُپے قرض طلب کیے۔ منیجر نے پوچھا، "کیا ضمانت دو گے؟"

کسان نے کہا، "میرے پاس بیس گائیں ہیں۔"

کسان کو رقم مل گیا۔ مدت بعد کسان بڑی رقم لے کر آیا اور اس میں سے دو ہزار رُپے گن کر بینک کو واپس کر دیئے۔ بینک کے منیجر نے کہا، "آپ باقی رقم ہمارے پاس جمع کروا سکتے ہیں۔"

کسان نے اسے گھور کر دیکھا اور بولا، "تمھارے پاس کتنی گائیں ہیں؟"

مرسلہ: نرگس نورین، کراچی

■ پہلا دوست: "سنا ہے کل تمھاری دکان کو آگ لگ گئی تھی؟

دوسرا دوست: ہاں بھئی ساری دکان جل گئی

پہلا دوست: کچھ بچا بھی؟

دوسرا دوست: صرف آگ بجھانے والی گاڑی کیوں کہ وہ دیر سے آئی تھی۔

مرسلہ: امیر عبداللہ، خانقاہ شریف بہاولپور

■ باپ: (بیٹے سے) کنجوس کی تعریف کرو!

بیٹا: کنجوس تعریف کے قابل ہی نہیں ہوتا۔

مرسلہ: غلام مصطفیٰ سولنگی، شکارپور

■ فقیر: (قاضی سے) حضور، بھوکا ہوں کچھ کھلا دیجیے۔

قاضی: یہ قاضی کا گھر ہے۔ قسم کھاؤ اور چلے جاؤ۔

مرسلہ: امداد حسین بلوچ، شہداد کوٹ

■ ایک کنجوس سیٹھ اپنے ڈرائیور کے ساتھ کہیں جا رہا تھا۔ اچانک اس نے گاڑی رکوائی اور ڈرائیور سے کہا کہ پیچھے ایک مونگ پھلی پڑی ہے جا کے اٹھا لاؤ۔ ڈرائیور

فوراً گیا اور مونگ پھلی اٹھالایا۔ سیٹھ صاحب نے مونگ پھلی توڑی تو اس میں سے دو دانے نکلے۔ ان میں سے ایک دانہ خود کھالیا اور دوسرا ڈرائیور کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا، "میاں، ہمارے ساتھ رہوگے تو یوں ہی مزے کروگے۔"

مرسلہ: سید فیصل احمد بخاری، کراچی

■ ایک شخص: میں نے سنا ہے کہ آپ کا لڑکا موٹر سائیکل چلانے کا رکارڈ قائم کررہا ہے۔"

دوسرا شخص: جی ہاں ابھی ابھی بارہویں دفعہ ہسپتال گیا ہے۔ مرسلہ: عارف احمد صدیقی

■ ماں: (بیٹے سے) بیٹا، دھوپ میں مت پھرا کرو سوکھ کر لکڑی بن جاؤ گے۔

بیٹا: کیا اماں، یہ لکڑیاں پہلے لڑکے تھے؟

مرسلہ: ملک محمد کامران اعوان، سکرنڈ

■ ایک دکاندار اپنے بے وقوف لڑکے کو دکان پر بٹھا کر کسی کام سے باہر گیا۔ ایک آدمی ایک کٹورے میں ایک آنے کا تیل لینے آیا۔ لڑکے نے اسے کٹورا بھر کر تیل دے دیا۔ اتنے میں اس کا باپ بھی آپہنچا اور لڑکے پر خفا ہونے لگا۔ لڑکا بولا، گاہک کو کچھ نہیں کہتے جو اتنا بڑا کٹورا لے کر آیا۔ مرسلہ: سائرہ رحمانی، ملتان

■ عقیل: (بے بی سے) بتاؤ گلئے اور گوالے میں کیا فرق ہے؟

بے بی: گلئے اصلی دودھ دیتی ہے گوالا پانی ملاکر۔

مرسلہ: تجمل حسین حیدری، پنڈ دادن

ہمدرد نونہال، نومبر ۱۹۸۶ء

■ گلی کے نکڑ پر ایک خالی بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس کے نزدیک سے ایک مولوی صاحب کا گزر ہوا۔ انھوں نے لکھا، "میں سب کے لیے دعا کرتا ہوں۔" اس کے بعد ایک وکیل صاحب کا گزر ہوا تو انھوں نے لکھا "میں سب کے لیے مقدمے لڑتا ہوں۔" وکیل کے بعد ڈاکٹر صاحب اس طرف آنکلے تو انھوں نے وہاں لکھا "میں سب کا علاج کرتا ہوں۔" جب ایک شہری نے وہاں سے گزرتے ہوئے یہ تحریریں پڑھیں تو اس نے آخر میں لکھا: میں ان سب شرفا کے بل ادا کرتا ہوں۔"

مرسلہ: سرور عرف صابر، چونیاں سرہا اوتاڑ

■ ایک صاحب اپنے دوست سے کہہ رہے تھے، "جب میں سوٹ پہن کر سبزی لینے جاتا ہوں تو دکاندار مجھے سبزی مہنگی دیتا ہے۔ جب پھٹا ہوا کرتا پہنتا ہوں جاتا ہوں، تو سبزی سستی مل جاتی ہے۔"

دوست فوراً بول اٹھا، "ہاتھ میں پیالہ لے کر جایا کرو، سبزی بالکل مفت مل جایا کرے گی۔"

مرسلہ: روبینہ فرید، کراچی

■ مالک! (نوکر سے) میں نے تم سے کہا تھا کہ چاول مرغی کے بچے کو کھلانا ہے۔ تم بلّی کو کیوں کھلا رہے ہو؟"

نوکر: "جناب، وہ بچہ بھی اب بلی کے پیٹ میں ہے۔"

مرسلہ: محمد عمر، لاہور

عجیب عجیب باتیں

لڑکھڑاتی ہوئی عبرت

پرانے زمانے میں یونان کی ایک ریاست اسپارٹا تھی۔ یہاں ایک شخص کو سرکاری افسر کے طور پر منتخب کیا گیا۔ اس کا کام صرف یہ تھا کہ روزانہ شراب پی کر سڑکوں اور گلیوں میں لڑکھڑاتا پھرتا، تاکہ نوجوان اسے دیکھ کر عبرت حاصل کریں اور شراب جیسی بُری چیز کو کبھی ہاتھ نہ لگائیں۔

ذہین لڑکی

۱۷۱۹ء میں فرانس کے کارڈیاک محل میں ایک بچّی جین لوئیس پیدا ہوئی۔ وہ تین مہینے کی تھی تو کتابوں کے حروف پہچاننے لگی تھی۔ تین سال کی عمر میں لاطینی زبان لکھنے اور پڑھنے لگی تھی۔ چار سال کی عمر میں اس نے انگریزی، جرمنی اور عبرانی سیکھ لی تھی۔ ۶ سال کی عمر میں ریاضی، تاریخ اور جغرافیہ سیکھ چکی تھی۔ اس بچّی کا سات سال کی عمر میں ۱۷۲۶ء کے دوران انتقال ہو گیا۔

انعام کا اعلان

بلا عنوان کہانی کا عنوان ۔ میٹھا زہر

خاص نمبر (ستمبر ۸۶ء) میں "عنوان لکھیے" کے تحت ہم نے جو بلا عنوان کہانی شائع کی تھی وہ بہت پسند کی گئی۔ ہزاروں نونہالوں نے اس کے عنوانات بھیجے۔ نونہالوں نے ۷۸ عنوانات تجویز کیے۔ اتنے سارے عنوانات میں سے بہترین اور صحیح عنوان منتخب کرنا بھی بڑا مشکل کام تھا۔ ہم نے بہت غور کر کے سب سے عمدہ عنوان "میٹھا زہر" کو بہترین عنوان قرار دیا ہے۔ یہ عنوان ۴۲ نونہالوں نے بھیجا ہے۔ ۵۰۰ رُپے ان پر تقسیم کیے جاتے تو ہر نونہال کو رقم کم ملتی۔ اس لیے اس انعام کی رقم بڑھا کر ۶۳۰ رُپے کر دی گئی۔ اس میں سے ہر نونہال کو ۱۵ رُپے انعام کے طور پر بھیج دیئے جائیں گے۔ ہم ان نونہالوں کو مبارک باد دیتے ہیں جن نونہالوں کو انعام نہیں مل رہا ہے ان کو بد دل نہیں ہونا چاہیے اور اپنے انعام پانے والے دوستوں کو مبارک باد دینی چاہیے۔

انعام پانے والے نونہالوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ عرفانہ افتخار، کراچی، ۲۔ عامر خان، کراچی، ۳۔ شبیر علی خاں، کراچی، ۴۔ خورشید احمد، راولپنڈی، ۵۔ محمد طارق، کراچی۔ ۶۔ شاہانہ بیگم، کراچی۔ ۷۔ عاصم مسعود علی، شہزاد معلوم۔ ۸۔ ارمان سرور، سرگودھا۔ ۹۔ فوزیہ خاتون کراچی۔ ۱۰۔ ریحانہ وحید، کراچی۔ ۱۱۔ محمد امجد، ارشد محمود، سرگودھا۔ ۱۲۔ صائمہ شریف، کراچی۔ ۱۳۔ سعید بشیر، کراچی ۱۴۔ آصف عباسی، کراچی۔ ۱۵۔ عاصمہ خان، کراچی۔ ۱۶۔ آنسہ نجم فروغ خان، حیدر آباد۔ ۱۷۔ محمد ساجد سلیم، کراچی۔ ۱۸۔ شمسہ کنول، نواب شاہ۔ ۱۹۔ زہرہ مہ جبیں، کراچی۔ ۲۰۔ فہمیدہ بانو، کراچی۔ ۲۱۔ آصف اشرف، کراچی۔ ۲۲۔ سعید احمد کراچی۔ ۲۳۔ سلیم، کراچی۔ ۲۴۔ بشریٰ تاج، سکھر۔ ۲۵۔ ساجد حفیظ، حیدر آباد۔ ۲۶۔ محمد زاہد کامل، کراچی۔ ۲۷۔ عبدالغفور بہاولنگر۔ ۲۸۔ مرتضیٰ علی حسن، کراچی۔ ۲۹۔ شاہین سحر، کراچی، ۳۰۔ نصرت جہاں، حیدر آباد۔ ۳۱۔ محمد ساجد، کراچی۔ ۳۲۔ شبانہ مطاہر، کراچی۔ ۳۳۔ تبسم کنول (پتہ درج نہیں)۔ ۳۴۔ صائمہ جلیل، شہداد پور۔ ۳۵۔ انجم صغیر، کراچی، ۳۶۔ صائمہ رؤف، کراچی۔ ۳۷۔ سید حمیر مدثر کراچی۔ ۳۸۔ شازیہ بشیر، نواب شاہ، ۳۹۔ عامر غوث، پٹارو، سندھ، ۴۰۔ حمیرا اسلام، کراچی۔ ۴۱۔ فہیم الدین قریشی، کراچی۔ ۴۲۔ ولیسرہ ناز بھٹی (انجم ناز بھٹی)، لاہور۔

اس شمارے کے مشکل الفاظ

نونہالوں کی خواہش پر ہر لفظ کے سامنے اُس زبان کا اشارہ بھی لکھا جا رہا ہے جس سے وہ لفظ اردو میں آیا ہے۔ یہ اشارے اس طرح لکھے ہوں گے، ع: عربی، ف: فارسی، ہ: ہندی، س: سنسکرت، ت: ترکی، انگ: انگریزی، ا: اردو۔

راہ گزر :(ف) رَ اہْ گُ زَ رْ: راستہ، سڑک۔

سرگرداں :(ف) سَرْ گَ رْ دَاں: حیران، پریشان۔

ملحوظِ خاطر :(ع) مَلْ حُوظِ خَاطِرْ: خیال رکھنا، دل سے توجہ رکھنا۔

بادلِ نخواستہ :(ف) بادِلے ناخَاستہ: دل سے نہ چاہتے ہوئے۔

سرزنش :(ف) سَرْ زَ نِشْ: ملامت، برا بھلا کہنا، باز پرس۔

سرِ شام :(ف) سَرِ شَا مْ: شام کی ابتدا۔

حتی الوسع :(ع) حَتْ تَلْ وُسْ عْ: جہاں تک ہو سکے، جس قدر ممکن ہو، بساط بھر۔

ہلال :(ع) ہِلَا لْ: پہلی رات کا چاند، نیا چاند۔

تند خو :(ف) تُنْ دْ خُو: بد دماغ، تیز مزاج، غصیلا۔

ستم ظریفی :(ف) سِتَمْ ظَرِی فِی: ظلم کرنا، غضب ڈھانا۔

مدعا :(ع) مُدْ دَ عَا: مقصد، مطلب، غرض۔

منقطع :(ع) مُنْ قَطَعْ: قطع ہونے والا، کٹنے والا۔

درگزر :(ف) دَرْ گُ زَ رْ: معافی، چھوڑ دینا، رفع دفع۔

بدر :(ع) بَدْ رْ: چودھویں کا چاند، پورا چاند۔

شیریں :(ف) شِی رِ یں: میٹھا، عزیز، پیارا، نرم، خوش گوار۔

سرخرو :(ف) سُرْ خْ رُو: کام یاب، خوش۔

عجز :(ع) عِجْ زْ: عاجزی، انکسار، منت سماجت۔

اسلاف :(ع) اَسْ لَا فْ: سلف کی جمع، بزرگ، اگلے وقت کے لوگ۔

شجاعت :(ع) شَجَا عَتْ: بہادری، دلیری۔

جوہر :(ع) جَوْ ہَرْ: قیمتی پتھر، اصل شے، خلاصہ، خاصیت، خوبی، ہنر، کمال۔

تعمیل :(ع) تَعْ مِیلْ: حکم بجا لانا، عمل کرنا۔

سلاسل :(ع) سَلَا سِلْ: سلسلہ کی جمع، زنجیر، بیڑی۔

صفت :(ع) صِفَتْ: خوبی، خاصیت، تعریف۔

غنی :(ع) غَنِی: دولت مند، بے پروا، بے نیاز۔

مستحق :(ع) مُسْ تَحِقْ: حق دار، حق رکھنے والا، لائق، قابل۔

کدورت :(ع) کُ دُو رَتْ: رنج، ملال، دل کا غبار، گدلا پن۔

رفاقت :(ع) رَ فَا قَتْ: ساتھ، اتحاد، ہمراہی۔

تابندہ :(ف) تَا بِنْ دَہْ: چمک دار، نورانی، روشن۔

آج کا نونہال - کل کا دانشور

اسے تیار کیجیے کہ فکر و شعور کا اُجالا کر سکے

قوموں کو جہالت کے اندھیروں سے نکالنے کے لیے اس کے دانشور اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ آپ کا یہ ننھا منا بچہ وطنِ عزیز کے روشن مستقبل کا امین ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اس میں ایک بڑی شخصیت پوشیدہ ہے... ہوسکتا ہے کل یہ ایک دانشور کی حیثیت سے ملک و ملت کے لیے مشعلِ راہ بنے۔

اس کی صلاحیتوں کو ابھارنے اور شخصیت کو نکھارنے کی ذمہ داری آپ پر ہے۔ اس ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے پورا کیجیے۔ اپنے بچے کی پرورش نہایت محنت، محبت اور توجہ سے کیجیے تاکہ کل یہ ایک مضبوط و توانا جسم، بہتر تعلیم اور صحت مند ذہن کے ساتھ وطنِ عزیز میں فکر و شعور کا اجالا کر سکے۔

نونہال ہربل گرائپ واٹر بچوں کی تکالیف مثلاً بد ہضمی، قبض، اپھارہ، اسہال، قے، بے خوابی، پیاس کی شدت وغیرہ کے لیے مفید و مؤثر دوا ہے۔ دانت آنے کے زمانے میں اس کا استعمال ضروری ہے۔

Adarts 2/84

منتخب کہانیاں

خاص نمبر (ستمبر ۱۹۸۵ء) میں انعامی کہانیوں کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس میں جو کہانیاں اول، دوم اور سوم آئی تھیں وہ فروری ۸۶ء میں شائع ہوئی تھیں۔ ان کے علاوہ پندرہ اچھی کہانیوں میں سے آخری دو کہانیاں یہاں شائع کی جا رہی ہیں:

زندگی کے موڑ پر

حنا فاروق، کراچی

نادیہ اتنی ہنس مکھ اور اتنی محبت کرنے والی لڑکی تھی کہ کالج کی ہر طالبہ سے پسند کرتی تھی۔ وہ کالج کے برآمدے میں پھولوں کی خوش بو کی طرح گھومتی رہتی تھی۔ قہقہوں کی آواز سے فوراً اندازہ ہو جاتا کہ نادیہ ادھر سے گزر گئی ہے۔ نادیہ نے آج تک کسی کا دل نہیں دکھایا تھا، بلکہ غم زدہ لڑکیاں تھوڑی دیر اس سے باتیں کر کے اپنی جھولیاں خوشی سے بھر لیتی تھیں۔ چند دنوں تک وہ کالج سے غائب رہی۔ سب حیران تھے کہ نادیہ تو غیر حاضر رہنے والی نہیں تھی۔ آخر اسے ہوا کیا ہے۔ ایک دن مس نصرت کلاس میں آئیں تو ان کے چہرے پر غم برس رہا تھا۔ پیریڈ ختم ہوتے ہی مس نصرت نے نادیہ کی پیاری سہیلی غزل کو الگ بلا کر بتایا، "غزل، تمھیں کچھ معلوم ہے کہ نادیہ کو کینسر ہو گیا ہے"۔ غزل کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔ وہ کافی دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ کینسر اور موت کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ ہوتا ہے۔ کینسر کے مریض کا بچنا ناممکن ہے۔

اُسی دن غزل نادیہ کے گھر گئی۔ نادیہ نے ہنستے ہوئے غزل کا استقبال کیا۔ غزل نے سوچا کہ شاید نادیہ کو اس بات کا علم نہیں کہ اسے کینسر ہے، لیکن نادیہ نے خود ہی بتایا، "غزل، شاید تمھیں معلوم ہو کہ مجھے کینسر ہے۔ میں نے ڈاکٹروں سے کہا تھا کہ میری بیماری مجھ سے نہ چھپائیں۔ میں ہر مصیبت کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ غزل تم تو جانتی ہو کہ میں موت سے نہیں ڈرتی"۔ اس کے بعد نادیہ نے قہقہہ لگایا اور غزل سے کالج کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔ غزل حیران تھی کہ یہ کتنی اعلا کردار کی لڑکی ہے۔ یہ بیماری اسے مسلسل اذیت نہیں دیتی تھی۔ وقتاً فوقتاً درد سے پڑتے تھے، چناں چہ نادیہ نے باقاعدہ کالج آنا شروع کر دیا۔ وہی مسکراہٹیں، وہی قہقہے، جن

لڑکیوں کو معلوم تھا کہ نادیہ کی زندگی صرف چند مہینوں کی ہے وہ یہ حوصلہ اور ہمت دیکھ کر حیرت میں ڈوب جاتی تھیں۔ دو مہینے اور گزر گئے اور اب نادیہ کی بیماری ہول ناک صورت اختیار کرنے لگی۔ اس لیے اُسے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ سارا کالج نادیہ کا گرویدہ تھا۔ لڑکیاں گروہ در گروہ اس کی تیمار داری کے لیے ہسپتال جاتی تھیں۔ ہسپتال میں اس کا کمرا پھولوں سے سجا رہتا تھا۔ کوئی پھول لے جا رہی ہے تو کوئی نئی کتابیں پیش کر رہی ہے۔ سب لڑکیاں محبّت بھرے دلوں سے اُس سے ملنے جاتی تھیں۔ ڈاکٹر اس کا علاج کرنے میں مصروف تھے، لیکن وہ جانتے تھے کہ اس جنگ میں انھیں شکست ہو گی۔ مرنے سے ایک دن پہلے اس نے اپنی ماں سے کہا، "ماں آج تم مجھ سے لپٹ جاؤ اور خوب پیار کرو۔" اس دن اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہ نکلی۔ جلد ہی اس نے آنسوؤں پر قابو پا لیا۔ اس کی ماں اور سہیلیاں رونے لگیں۔ اب حالت یہ تھی کہ نادیہ کی آواز اچھی طرح نہیں نکل رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے نرس سے کہا، "نرس اب اپنا ا[illegible] کسی جن ہٹالو۔ اب اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔" یہ کہہ کر نادیہ نے بڑے اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں اور یہ ہنستا مسکراتا چہرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

ہمدردی

بزم آرا، شہداد پور

"میں زیادہ پیسے لوں گا بس مجھے زیادہ پیسے چاہییں۔ نہیں تو میں اسکول نہیں جاؤں گا۔"

یہ ذیشان تھا جو اپنے والدین کو پہلی مرتبہ دھمکی دے رہا تھا۔ انھیں اس کی اس بات سے تعجب ضرور ہوا، لیکن انھوں نے اس کی اس دھمکی کو غیر شعوری طور پر منھ سے نکل جانے والے الفاظ سے تعبیر کیا، لیکن دو چار روز میں ہی ذیشان کے والدین یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اس کی ضد نے ایک مستقل عادت کی شکل اختیار کر لی ہے، اگر ہم اسی طرح اس کی ضد کے آگے ہار مانتے رہے تو اس کے فضول خرچ ہونے کا امکان ہے اور پھر ان کی استطاعت بھی اتنی نہیں تھی کہ وہ روز پانچ چھے رُپے جیب خرچ دیتے، کیوں کہ اس کے والد ایک دفتر میں ہیڈ کلرک تھے۔ وہ بہت ایمان دار اور محنتی شخص تھے۔ دفتر کا ہر شخص ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے ان کو پڑھا رہے تھے۔ وہ ان کی تمام خواہشات کا محور تھا۔

ذیشان پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ وہ بہت ذہین لڑکا تھا۔ ہر سال اپنی جماعت میں اوّل آتا تھا۔ اُسے جیب خرچ کی کبھی پروا نہیں ہوتی تھی، لیکن اب وہ زیادہ پیسوں کے لیے ضد کرنے لگا تھا۔ کبھی غصّہ

کرتا، کبھی لجاجت سے مانگتا۔ اس لیے اس کے والدین سخت پریشان تھے۔ اس سوچ میں ان کی نیندیں اُڑ گئی تھیں۔ ایک دن اس کے والدین نے غور کیا کہ وہ ان پیسوں کو کن اشیا کی خریداری پر صرف کرتا ہے تو ان کا ماتھا ٹھنکا، کیوں کہ کوئی بھی چیز ان کے سامنے ایسی نہیں تھی جس پر وہ پیسے خرچ کر رہا ہو، حتیٰ کہ اس کے والد نے اس کے ہم جماعتوں سے بھی معلوم کیا تو انھوں نے کہا کہ ہم نے اس کو کسی بھی خوانچہ والے سے کوئی شے خریدتے ہوئے نہیں دیکھا، بلکہ وہ تو وقفے میں ایک طرف بیٹھا رہتا ہے۔ اسی طرح دن گزرتے گئے۔ اس کے والدین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ انھوں نے اس کو سمجھایا، ڈرایا، سختی سے سرزنش کی، لیکن اس پر اثر نہ ہوا۔ اس کی رٹ یہی رہی کہ "بس زیادہ پیسے لوں گا"۔ اس کے والدین نے اسکول جاتے ہوئے اس کا تعاقب کیا۔ جب بھی وہ باہر جاتا اس کی نگرانی کرتے، لیکن ان باتوں کا کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوا۔

ایک دن ذیشان اسکول سے گھر آیا تو اس کے ماموں جان آئے ہوئے تھے۔ وہ انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوا اور جی بھر کر باتیں کیں۔ اس کے ماموں نے محسوس کیا کہ آج کل ذیشان کے والد اور والدہ کچھ پریشان ہیں۔ انھوں نے اس کی والدہ یعنی اپنی بہن سے پوچھا، "کیا بات ہے؟ آپ لوگ پریشان نظر آ رہے ہیں"۔ پہلے تو اس کی امّی نے ٹال دینا چاہا، لیکن ماموں جان کے اصرار پر بتانے پر مجبور ہو گئیں اور کہا، "ذیشان آج کل زیادہ جیب خرچ کا مطالبہ کرنے لگا ہے۔ نہ دینے پر اسکول نہ جانے کی دھمکی دیتا ہے"۔

جب شام کو ذیشان کھیل کُود کر گھر واپس آیا تو اس کے ماموں نے اس کو بُلا لیا اور پوچھا، لیکن ذیشان مسکرا کر ٹال گیا اور اسکول کے کام کا بہانہ بنا کر اُٹھ گیا۔ دوسرے دن پھر اس کے ماموں نے گھیر لیا۔ اس دن بھی کوئی نیا بہانہ تراشا اور کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ اس کے ماموں چند دن بعد چلے گئے۔ ذیشان کی ضد بہ دستور رہی۔ اس کے والد ایک دن ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس گئے اور ان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ بھی بہت حیران ہوئے کہ وہ تو بہت نیک اور ذہین بچّہ ہے، سمجھ دار ہے۔ شرارتیں بھی نہیں کرتا۔ وقفہ کے دوران بھی جماعت کے کمرے میں بیٹھا رہتا ہے۔ خیر ذیشان کے والد تو انھیں آگاہ کر کے چلے گئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اس کے ہم جماعت لڑکوں کو بُلایا اور اس کے بارے میں پوچھا کہ ذیشان اسکول میں کتنے پیسے خرچ کرتا ہے؟ انھوں نے کہا، "ہم نے تقریباً ایک ماہ سے اس کے پاس پیسے نہیں دیکھے۔ وقفے میں وہ کمرۂ جماعت سے باہر نہیں نکلتا"۔ انھوں نے لڑکوں کو واپس جانے کا اشارہ کیا اور خود سوچ میں غرق ہو گئے کہ ماجرا کیا ہے؟ پھر سوچا بچّہ ہے چند دن اور دیکھ لیتے ہیں پھر کوئی کارروائی کریں گے۔ دن اسی طرح گزرتے رہے۔ آخر عید آ گئی۔ عید پر ذیشان بہت خوش تھا۔ اس بار اس نے روزے بھی رکھے تھے پھر چچا اور ماموں بھی اپنے بچّوں کے ساتھ

آئے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے ابّو سے زیادہ عیدی لی۔ ماموں و چچا جان سے بھی زیادہ عیدی کا مطالبہ کیا۔ سب سے عیدی وصول کرنے کے بعد اس کے پاس سو رُپے تھے پھر اس نے اپنے جمع کیے ہوئے پیسے نکالے جو کتابوں میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ تقریباً پچاس رُپے تھے۔ عید کے دن بھی ذیشان نے پیسے خرچ نہیں کیے۔ نہ کھانے پینے کی کوئی چیز خریدی اور نہ کوئی کھلونا خریدا، لیکن وہ خوش بہت تھا۔ اس کے والدین کو خیال ہوا کہ عید کی خوشی تو بڑوں کو بھی ہوتی ہے تو بچے کو کیوں نہیں ہو گی۔

عید کے دوسرے دن تمام پیسے خاموشی سے لے کر ذیشان گھر سے نکلا۔ اس کے والد نے محسوس کیا کہ بچے نے کتابوں سے کچھ نکالا ہے اور اپنی پتلون کی جیب میں رکھا اور خاموشی سے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اس کے والد اس کی تاک میں تھے۔ ذیشان بھاگتا ہوا جا رہا تھا جلدی سے وہ نیشنل بینک پہنچا اور اپنے افریقی بھائیوں کے لیے صدارتی فنڈ میں اپنے جیب خرچ اور عیدی کے پیسے جمع کروانے کے لیے مینیجر کے پاس گیا تو وہ بچے کے معصوم جذبے سے بہت متاثر ہوا اور اسے تعریفی نظروں سے دیکھنے لگا۔ پیسے جمع کروانے کے بعد وہ واپس آ رہا تھا اس کے چچا اور والد راستے میں ہی تھے۔ انھوں نے ذیشان کو واپس آتے ہوئے دیکھا تو مطمئن ہوئے جب غور سے دیکھا تو اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا کاغذ نظر آیا۔ وہ قریب آیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے والد نے پریشان ہو کر اس کے ہاتھ سے کاغذ لے کر دیکھا تو وہ بینک کی رسید تھی۔ اس رسید کے بارے میں جب انھوں نے ذیشان سے پوچھا تو اس نے رندھی ہوئی آواز اور اشک بار آنکھوں سے بتایا، "ایک دن اسکول میں ہیڈ ماسٹر صاحب نے صبح دعا کے بعد ایک لیکچر دیا کہ افریقہ کے علاقے ایتھوپیا میں قحط پڑنے کی وجہ سے لوگ سخت پریشان ہیں ان پر سے یہ عذاب دُور ہونے کی دعا کریں اور جتنا بھی ہو سکے ان کے لیے نیشنل بینک میں قائم کیے ہوئے صدارتی فنڈ میں پیسے جمع کروادیں اور پھر میں نے ٹی وی پر ان فاقہ زدہ کم زور بچّوں کو دیکھا جو بہت بیمار تھے۔ اس کے بعد میں نے تہیّہ کر لیا کہ میں اپنی حیثیت کے مطابق ضرور ان کی مدد کروں گا۔ پھر مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ان کے عید کے کپڑے بھی نہیں بنے ہوں گے۔" یہ واقعہ سُن کر سب حیران رہ گئے۔ چچا جان نے فرطِ مسرت سے اُسے گلے لگا لیا۔ سب گھر والوں نے شاباش دی باری باری پیار کیا۔ اس کی امّی اور ابّا بھی بہت خوش ہوئے پھر انھوں نے کہا، "تم نے اپنے ہیڈ ماسٹر صاحب کے لیکچر کے بارے میں ہمیں کیوں نہیں بتایا ہم تمھاری مدد کرتے تو کام آسان ہو جاتا۔" اس پر ذیشان نے جواب دیا، "ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب نے یہ بھی تو بتایا تھا کہ اگر کسی کی مدد کی جائے تو اس کا اعلان نہ کیا جائے میں بھی یہ نیک کام سب کو بتائے بغیر کرنا چاہتا تھا۔" ایسی باتیں کرتا ہوا ذیشان سب کو بہت بڑا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اس کے خوشی سے دمکتے ہوئے سرخ سرخ چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ واقعی وہ بے حد خوش تھا۔ اسے عید کی سچّی خوشی مل گئی تھی۔

نونہال ادیب

حمد

مرسلہ: محمد ساجد، لانڈھی

سچ ہے یہ ربّ ذوالجلال ہے تُو
نور ہی نُور ہے، جمال ہے تُو

تیرا ثانی نہیں دو عالم میں
مالکِ مُلک بے مثال ہے تُو

سب ہیں تیرے کمال کے قائل
اصل سرچشمۂ کمال ہے تُو

کس طرح تُو خیال میں آئے
جب کہ بالاتے ہر خیال ہے تُو

ایک اِک شے کو ہے زوال مگر
میرے اللہ لازوال ہے تُو

تجھ سے دُوری کا ہو یقیں کیوں کر
دُور رہ کر شریکِ حال ہے تُو

حال راغب کہے تو کیا تجھ سے
داورا! رازدارِ حال ہے تُو

(راغب مراد آبادی)

نعت

مرسلہ: محمد ممتاز، حیدرآباد

اُن کے جو بھی غلام ہوتے ہیں
اُن پہ لاکھوں سلام ہوتے ہیں

خوش نصیبوں کے لب پہ ذکرِ رسول
صبح ہوتے ہیں شام ہوتے ہیں

جن کی راہیں ہیں آپ کی راہیں
وقت کے وہ امام ہوتے ہیں

خوش نصیبی کہ میرے سارے حروف
سبز گنبد کے نام ہوتے ہیں

دیکھتے ہیں جو سبز گنبد کو
قابلِ احترام ہوتے ہیں

حضرت سیف اللہ

خالد بن نیاز بھٹی، اسلام آباد

حضرت خالد بن ولیدؓ چھٹی صدی عیسوی میں پیدا ہوئے۔ آپ بہت مشہور و معروف سپہ سالار گزرے ہیں۔ آپ کا پورا نام خالد بن ولید بن مغیرہ المخزومی ہے۔ حضرت خالد بن ولید کا تعلق قریش کے ایک اونچے گھرانے سے تھا اور یہ خاندان اپنی شجاعت و بہادری کے لیے مشہور تھا، چناں چہ حضرت خالد کا شمار بھی قریش کے بڑے اچھے سپہ سالاروں میں ہوتا تھا۔ احد کی جنگ میں مسلمانوں کے خلاف جنگ بھی کی، لیکن آں حضرت کے مدینہ تشریف لے جانے کے بعد ۸ ھجری میں مدینہ جا کر اسلام قبول کیا اور وہیں رہنے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے کفّار کے خلاف بہت سی جنگوں میں حصّہ لیا اور مردانگی کے جوہر دکھائے۔

ایک جنگ میں حضرت خالدؓ اتنی بہادری اور جواں مردی سے لڑے کہ ان کے ہاتھ سے دشمن کی نو تلواریں ٹوٹیں۔ اس منظر کو دیکھ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو سیف اللہ کا خطاب دیا۔ سیف عربی میں تلوار کو کہتے ہیں۔ حضرت ابوبکر کی خلافت کے زمانے میں جب کئی لوگوں نے اپنے نبی ہونے کا دعوا کیا تو حضرت خالد ان سب کی سرکوبی کے لیے فوجیں لے کر گئے اور ان میں سے ہر ایک کا خاتمہ کر دیا۔ ایک دفعہ جب بعض قبائل میں بے دینی اور بغاوت پھیلنے لگی تو حضرت خالد کی سپہ سالاری میں ایک فوج بھیجی گئی جس نے کام یابی کے ساتھ بغاوت کو دبا دیا۔ حضرت ابوبکر نے حضرت خالد بن ولید کو ایران کی طرف فوج کشی کرنے کا حکم دیا، چناں چہ حکم کی تعمیل میں ایرانیوں کے ساتھ سب سے پہلا مقابلہ میدانِ سلاسل میں ہوا۔ اسلامی فوج کی تعداد صرف دس ہزار تھی اور ایرانی فوج کئی گنی زیادہ تھی، مگر ایرانی فوج کو شکست ہوئی۔

ایران اور عراق کی فتوحات کے بعد حضرت ابوبکر نے حضرت خالدؓ کو حکم دیا کہ وہ شام پر چڑھائی کریں۔ حضرت خالدؓ حکم کے مطابق شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں تمام چھوٹے شہر فتح کرنے کے بعد آپ دمشق پہنچے اور تین ماہ بعد اسے بھی فتح کر لیا۔ ایک دفعہ یرموک کے مقام پر رومیوں نے اپنی بہت بڑی فوج جمع کر لی۔ اس میدان میں رومیوں کی ۲ لاکھ ۴۰ ہزار فوج تھی اور مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی، لیکن اتنی دلیری سے لڑے کہ رومیوں کو یہاں بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۷ ہجری میں جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو انھوں نے حضرت خالدؓ کو واپس مدینہ بُلا لیا۔ کسی نے اس کی وجہ پوچھی تو آپؓ نے بتایا کہ میں نے خالدؓ کو اس لیے واپس بُلایا ہے کہ مسلمان یہ سمجھنا نہ شروع کر دیں کہ فتح صرف خالدؓ کے ہاتھ میں ہے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ نے تقریباً ساری عمر جہاد میں حصّہ لیا اور ہمیشہ شہید ہونے کی خواہش رہی مگر آپ بزرگ بہ اللہ کو پیارے ہوئے۔ آپؓ نے ۲۱ ھجری میں ۶۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔

طالب علم کی زندگی کا مقصد

مظہر شبیر حسین، کراچی

دنیا میں ہر شخص زندگی گزارنے کے لیے اپنے سامنے ایک منزل رکھتا ہے اور اس منزل تک پہنچنے کے لیے محنت اور کوشش کرتا ہے۔ جب انسان علم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ طالب علم کہلاتا ہے اور طالب علم بھی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور رکھتا ہے۔

طالب علم کی زندگی کا مقصد اپنی قوم اور ملک کی ترقی، بہتری اور خوش حالی ہوتا ہے۔ طالب علم یہ سوچتا ہے کہ وہ دل لگا کر اور اپنی پوری محنت سے اچھی تعلیم حاصل کرے گا اور علم سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائے گا اور ایک بامقصد زندگی گزارے گا۔

طالب علم اپنے آپ کو ایک اچھا شہری ثابت کرتا ہے اور دوسروں کو اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ وہ ملک کے قانون اور مسائل کو سمجھے اور قانون کے مطابق عمل کرے اور ملک کے مسائل کو حل کرنے میں قوم کی مدد کرے۔ طالب علم خود تو تعلیم حاصل کرتا ہی ہے، لیکن وہ دوسرے لوگوں میں بھی تعلیم کے فائدے اور خوبی بتا کر تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا کرتا ہے۔ لوگ صحیح کہتے ہیں کہ آج کے طالب علم کل کے لیڈر اور حاکم ہیں۔

اسلم کی شرارت

شاہدہ، کراچی

اسکول کی چھٹیاں تھیں۔ روفی میاں نے اپنا ہوم ورک مکمل کر لیا تھا۔ اب فرصت ہی فرصت تھی۔ گھر میں روفی کے خالہ زاد بہن بھائی بھی آتے ہوئے تھے۔ روفی میاں کے چچا جان جو قریب ہی رہتے تھے، اُن کے بچے بھی دن میں آجاتے اور پھر وہ اودھم مچتا کہ خدا کی پناہ۔ ایک دن روفی نے سوچا کہ یوں شور و غل کرنے اور گھر میں بھاگتے پھرنے سے بہتر ہے کہ کوئی اچھا کھیل کھیلا جائے۔ بہت سوچنے پر انھیں خیال آیا کہ کیوں نہ ایک اسٹیج ڈراما کیا جائے۔ خیال اچھا تھا اور پھر روفی تھے بھی ذہین۔ نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کے شوقین تھے، چناں چہ انھوں نے کئی دنوں کی محنت کے بعد ایک ڈراما لکھ ہی لیا۔ ڈراما کیا تھا۔ شہزادے کی کہانی کو ڈراما بنا دیا تھا۔

لکھنے کے بعد ڈراما کرنے کی باری آئی۔ روفی نے بہادر شہزادے کا کردار خود اپنے لیے رکھا اور باقی کرداروں کے لیے چچازاد بھائی اسلم، بہن فرزانہ، خالہ زاد بھائی وسیم اور اپنی بہن تہمینہ کو منتخب کیا۔ سب کو ان کے کردار سمجھائے۔ اسلم بادشاہ تھا۔ فرزانہ شہزادی، وسیم جن اور تہمینہ ہزرگ عورت۔ باقی سب تو مان گئے، لیکن اسلم اڑ گیا کہ شہزادے کا کردار میں کروں گا۔ سب نے سمجھایا، لیکن وہ نہ مانا۔ آخر روفی کو غصہ آگیا کہ ڈراما وہ لکھیں اور محنت بھی وہ کریں اور اسلم اس طرح نخرے دکھا رہے ہیں جیسے سب کچھ خود انھوں نے کیا ہو۔ روفی نے بھی فیصلہ سنا دیا، "جاؤ تمھیں ڈرامے سے نکال دیا۔" اسلم کو غصہ آگیا۔ جاتے جاتے کہہ گیا، "تمھارا ڈراما نہ بگاڑا ہو تو میرا نام بدل دینا۔"

کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی اور اپنی ریہرسل میں لگ گئے۔

کئی دن تک ریہرسل کی۔ پھر بڑے کمرے میں بچے نئے تخت پر ایک دن پہلے اسٹیج تیار کیا۔ محلے کے تمام بچوں کو کہہ دیا۔ کپڑے امّی کی مدد سے تیار کیے۔ شہزادی کے لیے امّی جان نے اپنا چمکیلا دوپٹا دیا۔ جن کے لیے بڑا سا ڈھیلا کُرتا۔ دانت اور ناخن بنانے کے لیے لہسن۔ بادشاہ کے لیے امّی کا سرخ شال اور بزرگ عورت کے لیے سفید چادر۔ اسلم کی جگہ بادشاہ روفی کے دوست ناصر کو بنا دیا گیا۔

ڈرامے کا دن آ پہنچا۔ تمام بچوں کو دری بچھا کر بٹھا دیا گیا۔ اسٹیج کی پچھلی دیوار پر ٹیوب لائٹ جل رہی تھی۔ چناں چہ کمرے کا دروازہ بند کرکے باقی تمام لائٹیں بجھا دی گئیں۔ پردہ ہٹا۔ اسٹیج پر ایک کرسی بچھی تھی، جس پر بادشاہ بیٹھا تھا۔ شہزادہ بادشاہ کے سامنے مودب کھڑا تھا۔ شہزادہ کہتا ہے: "بادشاہ سلامت مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔ میں شہزادی نیلوفر کو جن کے قبضے سے چھڑا لاؤں گا ورنہ میرا سر حاضر ہوگا۔"

بادشاہ جواب دیتا ہے: "ٹھیک ہے شہزادے! تم جا سکتے ہو۔ ہماری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔"

ابھی ناصر نے یہ کہا ہی تھا کہ اچانک اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ روفی کا منھ ناصر کی طرف تھا۔ ناصر کو کچھ اور مکالمے بولنے تھے کہ اچانک وہ دھڑام سے کرسی پر سے گر گیا اور بھاگتا ہوا اسٹیج سے نیچے اُتر گیا

اور پھر پیچھے بیٹھے ہوئے بچوں نے چیخنا شروع کیا: بھوت! بھوت! بچے چیخ رہے تھے اور اسٹیج کے چاروں طرف گھوم رہے تھے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اچانک ناصر نے پیچھے دیکھا۔ اس کے پیچھے ایک لمبا سا سیاہ سایہ کھڑا تھا۔ وہ چھلانگ مار کر اسٹیج سے نیچے کُودا اور بھاگ کر دروازہ کھول دیا۔ تمام بچے بھاگتے ہوئے باہر نکل گئے۔ سایہ بھی بچوں کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

اچانک روفی کو کچھ خیال آیا۔ اس نے ہاتھ مار کر بھوت کی چادر کھینچ لی اور اسلم جو بھوت بنا ہوا تھا تیزی سے کمرے سے بھاگ گیا۔ دراصل اسلم ڈراما شروع ہونے سے پہلے ہی تخت کے نیچے بھوت بن کر چھپ گیا تھا۔

خیر معاملہ دادا جان کی عدالت میں پیش ہوا۔ سب بہت ناراض تھے۔ روفی تو رو رہا تھا ہنس رہا تھا اُسے اپنی محنت کے ضائع ہونے کا دُکھ تھا۔ دادا جان نے سارا معاملہ سُنا اور اسلم کی طرف دیکھ کر پوچھا، "کیوں اسلم بیٹے، یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں؟" اسلم خاموش ہو گیا۔ دادا جان نے کہا، فیصلہ عشا کی نماز کے بعد ہوگا۔ اس وقت تم سب جاؤ۔ سب بچے بھاگنے لگے تو دادا جان نے اسلم کو روک لیا۔ اسلم کی یہ کوئی پہلی شرارت نہ تھی۔ وہ ایک شریر اور ضدی لڑکا تھا۔ دوسروں کو تنگ کرکے بہت خوش ہوتا تھا۔ دادا جان نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور کہنے لگے، "بیٹے اسلم! تم نہایت ہونہار بچے ہو۔ مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔ تم اپنی ذہانت کا غلط استعمال کرتے ہو۔ لوگ تم سے اسی لیے پیار نہیں کرتے۔ تمھارے

ساتھی تمہیں اپنے ساتھ کھلانا پسند نہیں کرتے۔ ذرا روفی کو دیکھو۔ کیسے نئے نئے اور ذہانت کے کھیل کھیلتا ہے۔ تمام بچے اس کے ساتھ شوق سے کھیلتے ہیں اور اسے پیار بھی تو سب کرتے ہیں۔" اسلم خاموشی سے سنتا رہا۔ اسے اپنے رویے پر شرمندگی تھی۔

عشا کے بعد سب بچے دادا جان کے کمرے میں دوبارہ جمع ہوئے۔ وہ سب فیصلہ سننے کو بے چین تھے۔ دادا جان نے کہا، "بچو! اسلم تم سب سے شرمندہ ہے اور معافی مانگتا ہے۔" اسلم نے سب سے معافی مانگی۔

دادا جان پھر بولے، "ڈراما دوبارہ ہوگا اور تمام تیاری اسلم کرے گا۔ ڈرامے کے درمیان اور بعد جو بھی کام ہو گا وہ اسلم کی ذمے داری ہے۔" روفی کھڑا ہوا اور بولا، "دادا جان، اگر اسلم شرمندہ ہیں تو ہم اس مرتبہ ان کی مدد کریں گے لیکن آپ وعدہ لیں کہ یہ آئندہ ایسی شرارت نہیں کریں گے۔" سب بچوں نے روفی کی تائید کی۔ اسلم نے وعدہ کیا کہ وہ اب ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچے۔

سب بچے خوش خوش شب بخیر کہتے ہوئے دادا جان کے کمرے سے چل دیے۔

اپنی دھرتی

حبیب الرحمٰن منڈوجام

دھرتی کسے پیاری نہیں ہوتی۔ خاص طور پر اپنے وطن کی دھرتی ہر کسی کو پیاری اور عزیز ہوتی ہے۔ دھرتی جسے ماں کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ دھرتی ہے بھی اس قابل کہ اس سے پیار کیا جائے۔ دھرتیاں تو بہت ہوتی ہیں، لیکن اپنی دھرتی ماں سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے۔ یہ وہ دھرتی یا زمین ہے، جس میں ہم سب کو ایک نہ ایک دن جانا ہے اور جس کا ہم پر بہت احسان اور بہت قرض ہے۔ ہم اس پر قربان بھی ہو جائیں تب بھی یہ احسان ادا نہ ہو۔

ہمارے پاکستان کی دھرتی تو ان چند عظیم دھرتیوں میں سے ایک ہے، جو اسلام کے مقدس نام پر عالمِ وجود میں آئی اور جس کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار خزانوں اور سہولتوں سے نوازا ہے۔ ہر ایک کو اپنی زمین سے محبت ہوتی ہے، لیکن جو پیار ہمیں اپنی دھرتی سے ہے۔ وہ شاید ہی کسی اور کو اپنی زمین سے ہو۔ ہماری دھرتی جس نے بہت سرد و گرم موسم دیکھے ہیں اس مہربان ماں کی طرح ہے جو ہر وقت اپنے جگر گوشوں کو ہر مشکل سے بچانے کے لیے اپنے اندر سمیٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہم اس مہربان ماں کی عزت کرتے ہیں اور ہمیشہ سر جھکائے اسے سلام کرتے رہیں گے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میری دھرتی ہمیشہ تابندہ و آباد رہے۔

چڑیا

نعیم کمال حمید، دوحہ قطر

چھوٹی سی اِک چڑیا ہے
ننھی منّی پیاری سی

جس پر ہے اِک دھاری سی

صبح سویرے آتی ہے
گھر بھر کو بہلاتی ہے
گیت سُہانے گاتی ہے
دانہ چُن کے جاتی ہے
روز سویرے آتی ہے
دل کو وہ بہلاتی ہے

چھوٹی سی اِک چڑیا ہے
ننھی مُنّی پیاری سی
جس پر ہے اِک دھاری سی

عمل سے زندگی بنتی ہے

محمد قدرت اللہ بیگ، میرپور خاص

عمل نام ہے انسان کی متحرک زندگی کا، جس سے انسان کی زندگی کے مناسب نتائج منظرِ عام پر آتے ہیں، یا جس کی جزا یا سزا آخرت میں ملتی ہے۔ اصل چیز انسان کا کردار ہے۔ کردار سے اس کی زندگی کے پوشیدہ پہلو، اغراض و مقاصد اور اس کی حقیقت کا پتا چلتا ہے۔ دوسری اور اہم چیز اخلاق ہے۔ جس انسان میں اخلاق کی سچائی ہوگی، اس کا میل ملاپ بہتر ہوگا، اس کے گفتار و کردار میں خلوص و صداقت ہوگی تو وہ انسان اور معاشرے میں پسند کیا جائے گا۔

جس قسم کا بھی عمل ہوگا اس کے مطابق زندگی بنے گی۔ اگر نیک عمل ہو، انسان نیکی کی جانب زیادہ توجہ دیتا ہو، دوسروں کے لیے اس کے دل میں سچی ہمدردی ہو، اپنی غرض کے ساتھ ساتھ دوسروں کے مقاصد بھی کارفرما ہوں تو وہ شخص دنیا میں بھی سُکھ چین کی زندگی گزارتا ہے اور آخرت میں بھی جنّت کا حق دار ہوگا۔

بہ قولِ اقبال:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

علّامہ اقبال نے کس سادہ اور سہل انداز میں ہمیں عمل کے نتیجے کی طرف مبذول کرایا ہے اور انسان کو عمل کی افادیت اور انجام سے روشناس کرایا ہے۔ اس شعر میں انھوں نے عملی زندگی کے نتیجے کی جانب مسلمانوں کی توجہ مبذول کرائی ہے۔

ہر انسان کا کردار، اخلاق، ہمدردی، بھلائی، اپنائیت، نیک سیرتی اور شرافت کا معیار اس کی عملی زندگی سے نمایاں ہوتا ہے۔ نیک سیرت اور شرافت کو ہر کوئی پسند کرتا ہے۔ اسے آخرت میں بھی اس کا اجر ملے گا اور دنیا میں بھی اس کا بول بالا ہوگا۔ اس کا نام دنیا عزّت سے لے گی اور اس کی دل سے عزّت کی جائے گی۔ اس کی سیرت اور کردار پر لوگ نیک نیتی سے تبصرے کریں گے۔

اب آپ ہی سوچیے کہ انسان کو اس کے نیک کردار اور نیک عملی زندگی کا اجر دنیا میں بھی ملا اور آخرت میں بھی اللہ اسے اس کا صلہ دے گا۔ یہ جھوٹ نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔ اس کی مثالیں ہمارے معاشرے میں

بھری پڑی ہیں اور اس کی سب سے واضح اور جیتی جاگتی مثال جناب محترم حکیم محمد سعید صاحب کی شخصیت میں پنہاں ہے۔ حکیم صاحب کی شخصیت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ لوگ ان کی نیک عمل زندگی کی تقلید کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ اپنی آیندہ نسل کے مستقبل کو ان کی پُر نور و عمل شخصیت میں روشن دیکھنا چاہتے ہیں۔

ہم نونہالانِ وطن و جوانانِ امروز پر لازم ہے کہ حکیم صاحب کی ہدایت کا احترام کریں۔ ان کے روشن مقاصد کی عملی تفسیر بنیں۔ ان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کریں، کیوں کہ ان کے بعد ہمیں ہی اس پاک وطن اور اس قلعۂ اسلام کی دل و جان سے حفاظت کرنی ہے۔

قلم اور کوّا

ایم۔ وائی قائم خانی، ٹنڈو الہ یار

ماسٹر صاحب کلاس روم میں داخل ہوئے اور کہا، بچّو!

بچّوں نے بلند آواز اور کورس کے انداز میں کہا، جی ماسٹر صاحب۔

ماسٹر صاحب نے کہا، پیارے بچّو! قلم کے چند مفید اور کار آمد استعمال تو بتلاؤ۔

بچّے اچانک خاموش ہو گئے۔ وہ تعجب سے استاد کا منھ تکنے لگے۔

ماسٹر صاحب نے ناراض ہوتے ہوئے کہا، میرا منھ کیا تک رہے ہو، جواب دو۔

بچّے خاموش رہے اور بہ دستور ماسٹر جی کی طرف دیکھتے رہے۔ استاد نے پھر غصّے سے کہا، نالائقو! اتنے آسان سوال کا جواب نہیں جانتے تم لوگ۔ بچّے ٹس سے مَس نہ ہوئے اور ماسٹر صاحب کی طرف دیکھتے رہے۔

نالائقو، احمقو! استاد نے چلّا کر کہا، قلم کے چند مفید اور کار آمد استعمال بتلاؤ۔

اب بھی بچّے دیوار کی مانند خاموش رہے تو ماسٹر جی نے بچّوں سے کہا، قلم دیکھا ہے کبھی؟

نفی میں سر کو جنبش دیتے ہوئے بچّوں نے کہا، نہیں جی۔

کیا کہا! استاد نے حیرت سے پوچھا، تم لوگوں نے کبھی قلم نہیں دیکھا۔

نہیں ماسٹر صاحب! بچّوں نے کہا، ہم جانتے نہیں کہ قلم کس بلا کا نام ہے۔

ماسٹر جی نے اپنی جیب سے قلم نکال کر بچّوں کو دکھاتے ہوئے کہا، اس نابکار چیز کو قلم کہتے ہیں۔

اچھا! بچّوں نے کورس کے انداز میں کہا، اس چیز کو قلم کہتے ہیں۔

ہاں اس واہیات چیز کو قلم کہتے ہیں۔ استاد نے کہا۔ اب اس چیز کے چند مفید اور کار آمد استعمال بتاؤ۔

کئی بچّوں نے اپنے ننھے مُنّے ہاتھ بلند کیے اور جواب دینے کے لیے بے چین نظر آنے لگے۔ ماسٹر صاحب نے ایک بچّے سے پوچھا، ڈبلو تم بتاؤ!

ڈبلو نے کہا، ہمارے ہاں قلم سے ازار بند ڈالنے کا کام لیا جاتا ہے۔

ماسٹر صاحب نے خوش ہوتے ہوئے کہا، بہت خوب، سُنا تم نے بچو! قلم سے ازار بند ڈالنے کا کام لیا جاتا ہے۔

ایک چھوٹے بچے نے جس کا نام ببلو تھا کہا، میں بتلاؤں قلم کا ایک مفید استعمال؟

ہاں ببلو تو بتا! ماسٹر صاحب نے کہا۔

قلم کان سے میل نکالنے کے کام آتا ہے۔

استاد نے خوش ہوتے ہوئے کہا، واہ وا، یاد رکھو بچو! مستقبل کے رکھوالو! قلم کان سے میل نکالنے کے کام آتا ہے۔

ایک بے حد چھوٹا بچہ زور زور سے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ ماسٹر صاحب نے اس سے کہا، ہیو، تم بتاؤ۔

ہیو نے کہا، ہمارے نانا ابّا قلم سے پیٹھ کھجاتے ہیں۔

سُبحان اللہ! استاد نے کہا، اس کا مطلب ہے کہ قلم پیٹھ کھجانے کے کام بھی آتا ہے۔

رمضانی نام کے ایک موٹے لڑکے نے بدکتے ہوئے کہا، قلم کا ایک مفید استعمال میں بتلاؤں؟

بتا! ماسٹر نے کہا۔

رمضانی نے کہا: ہم جب ہوم ورک نہیں کرتے تب آپ ہمیں قلم سے ٹوکے لگاتے ہیں۔

استاد نے جھینپتے ہوئے کہا، اور کوئی مفید استعمال بتاؤ۔

رمضانی نے کہا، قلم سے چیک پر دستخط کر کے بینک سے پیسے نکالے جاتے ہیں۔

اُس وقت کلاس روم کے دریچے سے اچانک ایک کوّا اُڑتا ہوا اندر آیا اور ایک بینچ پر بیٹھتے ہوئے کہا، ماسٹر جی، قلم سے قصیدے لکھے جاتے ہیں!!

کوّے کو بولتا دیکھ کر ماسٹر اور بچے دنگ رہ گئے۔ بچوں نے اپنی مختصر اور استاد نے اپنی طویل عمر میں کسی کوّے کو بولتے نہیں دیکھا تھا۔

کوّے نے کہا، قلم سے تحریروں اور سب ٹھیک ٹھاک کے پُل باندھے جاتے ہیں۔

ماسٹر صاحب نے کوّے سے کہا، تم کس قسم کے کوّے ہو کہ بول سکتے ہو؟

کوّے نے کہا، تاریخ کے ہر دور میں کوّے بولتے رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تم تاریخ سے نابلد ہو۔ بھائی تاریخی کوّے! تم ہمیں قلم کے تاریخی استعمال سے واقف کراؤ۔ ہم ممنون ہوں گے۔

کوّے نے کہا، قلم سے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کیا جاتا ہے۔ قلم کی مدد سے آپ گیدڑ کو شیر اور شیر کو گیدڑ بنا سکتے ہیں۔ قلم کی کرامات سے آپ میر جعفر کو محبِ وطن بنا سکتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ماسٹر اور بچے بے ہوش ہو جاتے بولنے والا کوّا سب کو ہکا بکا چھوڑ کر کھلے دریچے سے اُڑ گیا۔

عجیب و غریب پودے

سیما خانم، کراچی

قدرت نے بعض عجیب و غریب قسم کے پودے پیدا کیے ہیں جن کی خاصیت جان کر حیرت ہوتی ہے۔ افریقہ کے جنگلات میں پائے جانے والے بعض پودوں اور درختوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ آدم خور ہوتے ہیں۔ اُن پودوں میں عجیب و غریب قسم کی رسّی کی طرح جڑیں ہوتی ہیں جو قریب سے گزرنے والے انسان کو جکڑ کر ہلاک کر دیتی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض درخت ایسے ہوتے ہیں جو جان داروں کا خون چوس لیتے ہیں۔ یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں قصّے کہانی کی حیثیت تو رکھتی ہیں، لیکن ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ابھی تک کوئی ایسا پودا دریافت نہیں ہوا جو انسان کا شکار کرتا ہو، البتہ نباتات کی دنیا میں بعض ایسے پودے ہوتے ہیں جن کے پتّے ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے کیڑے اُن میں پھنس جاتے ہیں یا یہ پتّے ان کیڑوں کو جذب کر لیتے ہیں۔ ایسے پودوں کو ایسکی وَرس پودے کہتے ہیں۔

اس قسم کے پودے امریکا، آسٹریلیا، انگلستان اور ملایا کے دلدلی علاقوں میں پائے گئے ہیں۔ یہ پودے اپنے رنگ اور روپ اور نیکٹار کے ذریعہ سے اتنے خوب صورت لگتے ہیں کہ شکار (یعنی کیڑے مکوڑے) ان کی جانب بڑھنے لگتے ہیں۔ یہ پودے اپنے پتّوں کے مخصوص قسم کے نشو و نما کے باعث پھندے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، چناں چہ کیڑے مکوڑے اس میں داخل ہوتے ہی پھنس جاتے ہیں اور باہر نکلنے میں ناکام رہتے ہیں اور یہ پودے اپنے غدودوں کی ہاضم رطوبتوں کی مدد سے انھیں قابلِ ہضم بنا کر اپنے میں جذب کر لیتے ہیں۔ ان پودوں کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ نامیاتی غذا خود تیار کر لیتے ہیں اور کیڑے مکوڑوں کا گوشت ان کے لیے نائٹروجن اور سلفر وغیرہ مہیا کرتا ہے جو دلدلی زمین میں مفقود ہوتے ہیں۔ نائٹروجن کی غیر موجودگی میں کوئی پودا صحیح طور پر پروان نہیں چڑھتا، کیوں کہ یہ پروٹوپلازم کا اہم جزو ہے اور جو تمام حیات کا ماخذ ہے۔

اسی قسم کا ایک پودا وینس فلائی ٹریپ کہلاتا ہے یہ پودا امریکا کے زیادہ گیلے مقامات میں ملتا ہے۔ اس کے پتّے پھندے کا کام دیتے ہیں۔ یعنی دو مساوی حصّوں میں تقسیم ہوتا ہے، جس کے کنارے پر لمبے لمبے سخت بال اُگے ہوتے ہوتے ہیں۔ ان کی بالائی سطح پر دو قسم کے غدود ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو نیکٹار بناتے ہیں اور دوسرے وہ جو ہاضم رطوبتیں خارج کرتے ہیں۔ ان غدودوں کے علاوہ یعنی کے دو حصّوں پر تین تین نہایت حسّاس بال ہوتے ہیں۔ جیں ہی کوئی کیڑا نیکٹار کی تلاش میں اس کے پتّے پر بیٹھتا ہے اور کسی حسّاس بال سے مَس کرتا ہے۔ یعنی کے دونوں حصّے فوراً بند ہو جاتے ہیں۔ قیدی کیڑا باہر نکلنے کی کوشش کرتے کرتے ختم ہو جاتا ہے ہاضم غدود سے رطوبتیں نکلتی ہیں اور اسے ہضم کر کے

قابلِ جذب بنا دیتی ہیں۔ چند روز کے بعد یہ پھندا کھلتا ہے اور غیر ہضم شدہ حصّے کو باہر دھکیل دیتا ہے۔

اسی قسم کا ایک چھوٹا سا صراحی نما پتّوں والا پودا ہمالیہ اور جزیرہ ملایا میں پایا جاتا ہے۔ اس پودے میں بھی شکار کو پھانسنے کا کام پتّوں سے لیا جاتا ہے۔ صراحی نما حصّے کے اوپر ایک ڈھکن سا لگا رہتا ہے۔ یہ گہرے رنگ کا ہوتا ہے۔ صراحی کے منھ میں نیکٹار بنانے والے غدود ہوتے ہیں اور منھ سے اندر کی جانب پھیلنے والا حصّہ شروع ہو جاتا ہے۔ صراحی کے پیندے میں نیکٹار اور بارش کا پانی جمع رہتا ہے جسے حاصل کرنے کے لیے کیڑے مکوڑے نیچے اُترتے ہیں اور ان میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ صراحی کی اندرونی دیواروں سے رطوبتیں خارج ہو کر اس کے لحمیات کو ہضم کرتی ہیں

اس قسم کے اور بھی کئی پودے ہوتے ہیں جن میں ایک تھیلی نما پتّوں والا پودا بلیڈر ورٹ کہلاتا ہے جو پاکستان کے چاول کے کھیتوں اور کشمیر کی جھیلوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ اسی قسم کا ایک اور پودا سن ڈیو بھی ہے۔ شبنمی پتّوں والا یہ پودا صرف چند سینٹی میٹر اونچا ہوتا ہے۔ اس کے چاروں طرف پتلے پتلے چمکیلے اور لیس دار بال لگے ہوتے ہیں۔ ان بالوں سے رطوبت خارج ہوتی ہے جو کیڑے کے جسم کو جذب کر کے پودے کے لیے قابلِ استعمال بنا دیتی ہے۔ جونہی کوئی کیڑا اس کے پتّے پر بیٹھتا ہے یہ بال اسے چاروں طرف سے جکڑ لیتے ہیں اور کیڑا اس کے اندر مر جاتا ہے۔ اپنا کام کرنے کے بعد یہ بال پھر کھل جاتے ہیں اور اپنی پہلی شکل میں دوسرے شکار کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔

فیض احمد فیض

محمد صابر زاہد، کراچی

فیض احمد فیض ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے چار سال کی عمر میں ۱۹۱۵ء میں حفظِ قرآن کیا اور ۱۹۱۶ء میں مولوی ابراہیم سیال کوٹی کے مکتب میں داخلہ لیا۔ ۱۹۲۷ء میں سیال کوٹ کے اسکاچ مشن ہائی اسکول سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۲۹ء میں مرے کالج سیال کوٹ سے فرسٹ ڈویژن میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ انھوں نے ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے عربی میں بی۔ اے آنرز کیا اور ۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور ہی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں بھی فرسٹ کلاس ایم اے کیا۔ فیض احمد فیض کو بچپن ہی سے علم و ادب سے بہت لگاؤ تھا۔ ان کے والد سیال کوٹ کی مشہور شخصیت تھے۔ اُن کے گھر میں علم و ادب کا چرچا رہتا تھا۔

فیض احمد فیض کی ادبی شہرت کا آغاز ۱۹۲۸ء میں اس وقت ہوا جب انھوں نے مرے کالج سیال کوٹ کی ادبی تنظیم اخوان الصفا کے مشاعرے میں اپنی پہلی غزل سنائی۔ ان کی پہلی نظم "میرے معصوم قاتل" کے عنوان سے ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے میگزین "راوی"

میں شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے ۱۹۳۵ء میں ایم اے او کالج امرتسر میں انگریزی لیکچرر کی حیثیت سے عملی زندگی میں قدم رکھا۔ وہ ۱۹۴۲ء میں فوج میں کیپٹن کی حیثیت سے بھرتی ہوئے اور ۱۹۴۳ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچ گئے۔ ۱۹۴۷ء میں انھوں نے فوجی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ فیض احمد فیض کے کلام کا ترجمہ دنیا میں تقریباً تمام ترقی یافتہ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ادبی خدمات کی وجہ سے انھیں لینن امن انعام بھی ملا تھا۔

فیض اس عہد کے مقبول ترین شاعروں میں سے تھے۔ ان کی شاعری ہمارے لیے ایک اعزاز ہے جو ہمیشہ ہمارے دلوں کو گرماتی رہے گی۔ ان کا انتقال ۱۹۔ نومبر ۱۹۸۴ء کو لاہور میں ہوا۔

تاریخی شہر شیخو پورہ

رحمت اللہ بھی، روہڑی

پاکستان میں بہت سے تاریخی شہر ہیں، جن میں ایک شیخو پورہ بھی ہے۔ اس شہر کو مغل خاندان نے آباد کیا تھا۔ شہنشاہ اپنے بیٹے جہانگیر کو شیخو کہہ کر پکارتا تھا۔ اس شہر کا نام اسی مناسبت سے شیخو پورہ پڑ گیا۔ شہر میں بس اسٹینڈ کے قریب مغلیہ دور کا بنایا ہوا قلعہ آج بھی موجود ہے۔ یہ قلعہ بہت وسیع ہے۔ اب اس کی دیواریں ٹوٹتی جا رہی ہیں۔ شیخو پورہ میں ایک سیر گاہ بھی ہے، شہر سے تقریباً چار کیلو میٹر دور ہے۔ اس سیر گاہ کو ہرن مینار کہتے ہیں۔ یہ مینار اور سیر گاہ جہانگیر کی تعمیر کرائی ہوئی ہے۔ اس مینار کے نیچے ایک ہرن دفن ہے جو جہانگیر کا پالتو تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جہانگیر کا ایک ہرن تھا جو اُسے بہت ہی پیارا تھا۔ ایک دن وہ شکار پر گیا اور اپنے ساتھ ہرن کو بھی لے گیا۔ راستے میں وہ ہرن مر گیا۔ جہانگیر کو ہرن کے مرنے کا بہت صدمہ ہوا۔ اس نے اسی جگہ ہرن کی قبر بنانے کا حکم دیا اور قبر کے اوپر ایک مینار تعمیر کروایا۔ جسے آج ہم ہرن مینار کے نام سے جانتے ہیں۔ اس مینار کے قریب ہی ایک عمارت ہے، جس کے بارہ دروازے ہیں اور بارہ دری کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا ایک دروازہ ایسا ہے جس سے آدمی اندر داخل ہوتا ہے۔ اس کے اندر داخل ہونے کے بعد اُسے بارہ دروازے نظر آتے ہیں۔ وہ اس میں گشت لگاتے ہوئے دل میں سوچتا ہے کہ وہ جس دروازے سے اندر آیا ہے وہ اس سے باہر نہیں جائے گا بلکہ کسی دوسرے دروازے سے باہر نکلے گا۔ وہ جب دوسرے دروازوں سے گزرتا ہے تو اُسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ وہ پھر بار بار کسی دوسرے دروازے سے نکلنے کے لیے اندر جاتا ہے پھر باہر نکل آتا ہے۔

اس عمارت کے سامنے ایک تالاب بھی ہے جو بہت ہی خوب صورت ہے۔ شیخو پورہ میں اور بھی بہت سی مشہور عمارتیں ہیں جو دیکھنے کے قابل ہیں۔ شیخو پورہ سے تقریباً نو کیلو میٹر دور ایک گاؤں ہے جس کا نام

جنڈیالہ شیر خان ہے۔ سید وارث شاہ جنھوں نے ہیر اور رانجھے جیسی مشہور نظم لکھی ہے اسی گاؤں میں پیدا ہوئے، ان کا مزار اسی گاؤں میں ہے۔

کبوتر

مرسلہ: فریحہ اختر، کراچی

بھولی بھالی صورت والے
کچھ ہیں بھورے کچھ ہیں کالے
چھتری پر بیٹھیں اُڑ جائیں
بچے آ کر دانہ کھائیں
میرے بھولے بھالے کبوتر
میرے دیکھے بھالے کبوتر

ماں، عظیم ماں

مرسلہ: محمد شفیق، قصور

- جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ (حضور اکرمؐ)
- ماں کے بغیر گھر قبرستان لگتا ہے۔
(اورنگزیب عالمگیر)
- دنیا کی بہترین شے ماں اور صرف ماں ہے۔
(مولانا محمد علی جوہر)
- ماں باپ سے زیادہ شفیق ہوتی ہے۔
(افلاطون)
- سخت سے سخت دل کو ماں کی پُرنم آنکھوں سے نرم کیا جا سکتا ہے۔ (علامہ اقبال)
- ماں اور پھول میں مجھے کوئی فرق نظر نہیں آتا۔
(نادر شاہ)
- ماں کا غصہ وقتی ہوتا ہے جو جلد ہی زائل ہو جاتا ہے۔
(ورڈزورتھ)
- دنیا کا کوئی رشتہ ماں سے زیادہ پیارا نہیں ہوتا۔
(شیلے)
- ماں کا پیار کسی کو بنانے اور سکھانے کا نہیں۔
(لقمان)
- اگر مجھ سے ماں کو چھین لیا جائے تو میں پاگل ہو جاؤں۔
(فردوسی)
- حسرت کے ہجوم اور خوشیوں کے طلاطم میں ماں کی عظمت کو دیکھو۔
(نپولین بوناپارٹ)
- آسمان کا بہترین تحفہ ماں ہے۔ (ملٹن)
- ماں کا پیار سب سے خوب صورت اور بہترین ہے۔
(چارلس ڈکنز)
- میں زندگی کی کتاب میں ماں کے سوا کسی تصویر کو نہیں دیکھ سکتا۔
(ڈاکٹر ہوگر)
- اس بات کا موقع نہ آنے دو کہ ماں نفرت کرے یا بددعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ (بوعلی سینا)
- میری عمر ۵۰ برس ہو چکی ہے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میری ماں میرے گھر آنے سے پہلے سو چکی ہو۔
(ویبسٹر)
- بچے کے لیے سب سے اچھی جگہ ماں کا دل ہے، خواہ بچے کی عمر کتنی ہی ہو۔
(شیکسپیئر)

محنت کی عظمت

ندیم احمد نعمانی، کراچی

کچھ سال پہلے کی بات ہے سندھ کے ایک گاؤں میں ایک زمین دار رہتا تھا۔ اس کا نام رحیم احمد تھا۔ وہ بہت نیک اور پرہیزگار تھا۔ وہ دوسروں کے غم اور خوشی میں شریک ہوتا۔ اس کے بہت سے کھیت تھے۔ ان پر جتنے کسان کام کرتے سب بہت خوش تھے، کیوں کہ وہ سب کو ان کی محنت کا پورا پورا صلہ دیتا ہے۔ اس کے کھیتوں پر کام کرنے والے کسانوں میں ایک کسان بہت محنتی تھا۔ اس کا نام قاسم تھا۔ قاسم کی بیوی پڑھی لکھی تھی۔ اس کے دو بچے تھے۔ ایک بچہ جس کا نام شاہد تھا اور لڑکی کا نام حنا تھا۔ قاسم دن بھر کھیتوں میں کام کرتا اور باقی وقت میں اس کے زمین کا چھوٹا سا حصّہ تھا اس پر کام کرتا۔ قاسم نے اپنے دونوں بچّوں کو اسکول میں داخل کروادیا۔ دونوں بچّے بڑے ذہین تھے خوب دل لگاکر پڑھتے اور اپنی کلاس میں اوّل آتے۔ شاہد کی خواہش تھی کہ وہ بڑا ہو کر ڈاکٹر بنے گا۔ شاہد نے میٹرک کا امتحان دیا تو وہ پورے ضلع میں اوّل آیا۔ اس کے والد نے اسے گلے سے لگالیا۔ اس کی بہن بھی بہت خوش ہوئی۔

شاہد نے اس کو آگے تعلیم کے لیے شہر بھیج دیا اور خود اسی محنت اور لگن سے کام کرنے لگا۔ اس نے کافی ترقی کرلی۔ اس نے کئی زمینیں خرید لیں۔ ان پر کام کرنے کے لیے کسان رکھ لیے۔ اس کی بیٹی بھی ٹیچر بن گئی اور اس نے ایک اسکول گاؤں کے بچّوں کے لیے کھول لیا اور اس کی ماں اور وہ دونوں اس اسکول میں بچوں کو خوب لگن سے پڑھانے لگیں۔

ادھر شاہد بھی شہر میں خوب محنت اور لگن سے پڑھتا رہا اور اس نے شہر کے ایک مڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ چاروں اپنی اپنی جگہ اپنا کام پوری محنت اور لگن سے انجام دے رہے تھے۔ حنا کا اسکول بھی ترقی کر رہا تھا۔ اس نے اپنے اسکول میں دینی تعلیم پر خاص توجہ دی تھی۔

قاسم کے گھر کے حالات اب کافی بدل گئے تھے۔ وہ پورے گاؤں والوں کی نظر میں ایک معزز شخص کہلانے لگا۔ وہ کافی امیر ہو گیا تھا، لیکن اس نے غرور نہیں کیا۔ وہ اپنے گاؤں کی ترقی میں بھی حصہ لیتا تھا۔

ادھر شاہد بھی خوب محنت سے پڑھتا رہا اور ڈاکٹر بن گیا۔ جب وہ گاؤں واپس آیا تو بہت خوش تھا، کیوں کہ وہ اب صرف شاہد نہیں بلکہ ڈاکٹر شاہد قاسم بن گیا تھا۔ اس نے ایک ہسپتال غریبوں کے لیے قائم کیا اور اپنا ایک کلینک بھی کھولا۔ وہ دن کو اپنے کلینک پر بیٹھتا اور رات کو ہسپتال چلا جاتا۔ اس طرح قاسم کی محنت رنگ لائی اور اس کو اس کی محنتوں کا صلہ مل گیا۔

صدر جنرل حسین محمد ارشاد

سعد عبدالجلیل شاہ، لاہور کینٹ

جنرل ارشاد بنگلہ دیش کے شہر رنگ پور میں یکم فروری ۱۹۳۱ء کو اس دنیا میں رونق افروز ہوئے۔ آپ نے فوجی تربیت آفیسرز ٹریننگ اسکول کوہاٹ سے حاصل کی زندگی کی بائیسویں منزل میں ایسٹ بنگال رجمنٹ میں کمیشنڈ افسر کی حیثیت سے شرکت کی۔ ۱۹۶۹ء میں آپ کو ایسٹ بنگال رجمنٹ کے بٹالین کا کمانڈنگ آفیسر بنایا گیا۔ یہ بہت بڑی ذمے داری تھی۔ آپ نے اس ذمے داری کو نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ ۱۹۷۱ء میں جنگ کے دوران ایک اور بٹالین کی قیادت بھی کی۔ ۱۹۷۵ء میں آپ کو میجر جنرل کے عہدے پر ترقی دی گئی اور آپ کو بنگلہ دیش کی فوج کے ڈپٹی چیف آف آرمی اسٹاف کی ذمے داری بھی سنبھالنی پڑی۔ ۱۹۷۸ء میں آپ کو چیف آف آرمی اسٹاف جیسی ذمے داری بھی سونپی گئی۔ آپ کی لیاقت کو دیکھتے ہوئے یہ اہم کام آپ کے ہی ذمے لگایا گیا۔

صدر جنرل ضیاء الرحمٰن کے انتقال کے بعد، جب بنگلہ دیش کے حالات بگڑ گئے تو آپ کو مجبوراً مارشل لا لگانا پڑا، چنانچہ آپ خود مارچ ۱۹۸۲ء میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔ اس وقت سے آپ نے بنگلہ دیش کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آپ کو متعدد ممالک کے سربراہوں نے دورے کرنے کی دعوت دی، جسے آپ نے قبول کر لیا۔ آپ فٹ بال کے بہت اچھے کھلاڑی بھی ہیں۔ آپ نے کھیلوں کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ ایک نیک دل، رحم دل اور انصاف پسند انسان ہیں۔ آپ نے بنگلہ دیش کو از سر نو تعمیر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آپ کا تعلق ایک اچھے اور شریف گھرانے سے ہے، اسی لیے آپ میں شرافت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ آپ میں محنت، لگن اور آگے بڑھنے کا بہت ہی زیادہ جذبہ ہے۔ آپ کی حکومت کے دوران پاکستان کے ساتھ تجارتی اور سفارتی تعلقات کو تقویت حاصل ہو رہی ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے شادی کے پچیس سال بعد بیٹا عطا کیا۔ آپ دیانت داری کو اپنا نصب العین سمجھتے ہیں۔ آپ ایک جری اور بہادر فوجی جرنیل ہیں۔ آپ غریبوں اور محتاجوں کی بہت مدد کرتے ہیں اور ذرا بھی مغرور نہیں ہیں۔

سکون بڑی دولت ہے

ساجد قیوم خانزادہ، اسکرنڈ

کسی گاؤں میں ایک شکاری رہتا تھا۔ وہ دن کو جنگل میں جانوروں کا شکار کرتا اور شام کو اُسے فروخت کر کے کھانے پینے کا سامان لے کر گھر چلا جاتا۔ اس طرح اس کی گزر بسر ہو رہی تھی۔ اس کی بیوی بہت ہی نیک دل تھی۔ ایک دن حسبِ معمول شکاری شکار کھیل رہا تھا کہ ایک چڑیا زخمی ہو کر گر پڑی۔ شکاری کو اس ننھی سی جان پر رحم آ گیا۔ وہ اسے گھر لے آیا اور چڑیا کی مرہم پٹی کی کہ ایک دم چڑیا ایک حسین و جمیل پری میں تبدیل ہو گئی اور اس نے کہا "اے شکاری، میں

کوہ قاف کے بادشاہ کی بیٹی ہوں۔ ایک دن بادشاہ نے غصّے میں آکر مجھے چڑیا بنا دیا اور ایک ظالم شکاری نے مجھے زخمی کر دیا۔ تم نے میری مرہم پٹی کی، بولو تم کیا مانگتے ہو، لیکن صرف ایک چیز مانگنا۔"

شکاری اور اس کی بیوی سوچ میں پڑ گئے۔ پری نے انھیں سوچ میں مبتلا دیکھا تو بولی، "میں کل پھر آؤں گی۔ تم سوچ لو۔" یہ کہہ کر پری غائب ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد شکاری کی بیوی نے کہا، "کل ہم پری سے دولت مانگ لیں گے۔" شکاری نے کہا، "نہیں اس ملک کی بادشاہی مانگ لیں گے۔" بیوی نے کہا، "نہیں، ایک محل تعمیر کرائیں گے۔" اس طرح دونوں میں اختلاف ہوتا رہا۔ دوسرے دن جب پری آئی تو وہ بولی، "بولو کیا مانگتے ہو؟" شکاری نے کہا، "اچھی پری، اگر آپ ہمیں کچھ دینا ہی چاہتی ہیں تو مہربانی کر کے ہمارا سکون واپس کر دیں، اس لیے کہ دولت کے لالچ میں ہم اپنا سکون کھو بیٹھے ہیں۔" یہ سُن کر پری خوش ہوئی اور کہا، "واقعی دنیا کی سب سے بڑی نعمت سکون ہے۔" یہ کہہ کر پری نے ایک اشرفیوں کی تھیلی شکاری کو دی اور غائب ہو گئی۔

دھما کا

سعدیہ سیما، کراچی

ہمیں بچپن سے کہانیاں سننے اور پڑھنے کا بے حد شوق تھا اور جوں جوں میں بڑی ہوتی گئی یہ شوق بڑھتا گیا۔ نانی اماں جب بھی ہمارے گھر آتیں سب بچے انھیں گھیر لیتے اور رات گئے تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ نانی اماں سناتی بھی تو تھیں بڑے مزے کی کہانیاں، جن کو سُن کر کبھی تو بے اختیار ہنسی آجاتی اور کبھی مارے ڈر کے رُونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ کہانیاں سنتے سنتے باجی، بھیّا اور چھوٹے بھائی سب سو جاتے، لیکن میں جاگتی رہتی۔ مجبوراً نانی اماں کہتیں، "اب تم بھی سو جاؤ گڑیا، باقی کہانی کل۔"

نانی اماں کی ایک سہیلی تھیں جو اکثر نانی اماں کے ساتھ آیا کرتی تھیں۔ جب وہ آتیں تو ہماری شامت آجاتی تھی۔ وہ ہر وقت نانی اماں کو باتوں میں الجھائے رکھتیں اور ہمیں کہانیاں سننے نہ دیتیں اور ہم پر حکم تو ایسے چلاتیں جیسے ہم ان کے نوکر ہیں۔ "عاصم پان لادو۔" وہ بھیّا کو حکم دیتیں، "رانی تم میرے کپڑے استری کر دو۔" باجی کو کام بتا یا جاتا، "گڑیا تم پان دھو کر رکھنا۔" غرض ہم تینوں ان کے کام میں مصروف رہتے۔ اتنے کام تو ہم سے امّی بھی نہیں لیتی تھیں۔ اب کی بار جو چھٹیوں میں پھر وہ نانی اماں کے ساتھ وارد ہوئیں تو ہماری جان ہی جل کر رہ گئی۔ ہم نے بھی اُن سے بدلا لینے کا سوچ لیا تھا۔ باجی نے بڑے ادب اور احترام کے ساتھ ان کو صبح کی چائے پیش کی۔ محترمہ صبح چائے کی عادی تھیں۔ انھوں نے بڑی شان سے ایک گھونٹ بھرا اور اس کے ساتھ ہی اُبکائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چائے میں نمک ہی نمک تھا۔ "رانی، رانی!" وہ غصّے میں پکارتی

رہ گئیں اور باجی یہ جا وہ جا۔

"پان لادوں؟" بھیا نے سعادت مندی سے پوچھا۔

"ضرور بیٹا جُگ جُگ جیو، پھولو پھلو، دودھوں نہاؤ۔"

انھوں نے دُعا دے ڈالی۔ اسپیشل پان پیش کیا گیا اور پھر ان کے منھ کی جو حالت ہوئی وہ کچھ نہ پوچھیے۔ پان میں چونا بڑی مقدار میں ڈلوایا گیا تھا۔ دن گزر گیا تھا۔ رات آگئی تھی۔ اب میری اور چھوٹے بھائی کی باری تھی بدلا لینے کی۔ ہم نے تہیّہ کر لیا تھا کہ ان کو اپنے گھر میں ایک دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنے دیں گے۔ ہم صبح سے سوچ سوچ کے پریشان تھے، لیکن کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اچانک میں بیٹھے بیٹھے اُچھل پڑی۔ دُور کہیں سے پٹاخے کی آواز آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی میں بول اُٹھی، "آگئی بھائی ترکیب سمجھ میں۔"

"وہ کیا؟" انھوں نے سوال کیا۔

ہم دونوں نے اس رات بڑی تن دہی سے سب گھر والوں کے بستر لگائے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ سب کے پلنگ باہر لگے ہوئے تھے۔ نانی اماں اپنی سہیلی کے ساتھ اپنے پلنگ پر پہنچ گئیں۔ نانی اماں کی بھاری بھرکم سہیلی جیسے ہی پلنگ پر بیٹھیں زور دار دھما کا ہوا اور وہ بُری طرح چیخنے چلّانے لگیں۔ ہوا یہ کہ ان کے پلنگ کے پایوں کے نیچے پٹاخے رکھے گئے تھے اور یہ دھما کا پٹاخوں کا تھا، پھر جو انھوں نے لعنت ملامت اور واہی تباہی بکنا شروع کی تو اُف توبہ۔ وہ ایک منٹ رُکنے کو تیار نہ تھیں۔ بڑی مشکلوں سے انھیں نانی اماں نے روکا، لیکن صبح ہوتے ہی وہ روانہ ہو گئیں۔ اس کے بعد ہماری جو کھنچائی ہوئی وہ آج تک یاد ہے۔ ڈانٹ سننے کے بعد ہم نے سُکھ کا سانس لیا کہ چلو ان سے جان تو چھوٹی۔ وہ دن اور آج کا دن نانی اماں کی سہیلی پھر کبھی پلٹ کر ہمارے گھر نہیں آئیں۔

واہ رے بہادر

صائمہ مسعود، گلگت

ہمارے چچازاد بھائی جب ہمارے گھر آئے تو ہمارے مزے ہو گئے۔ چڑیا گھر، پارک، شالیمار باغ غرض روزانہ کہیں نہ کہیں کی سیر کی جاتی۔ ہمارے چچازاد بھائی جن کا نام فراز ہے بڑی شیخیاں مارتے ہیں۔ ایک دن کہنے لگے، "بھئی صائمہ، ہمارے اسکول میں ایک جن آگیا۔ میں نے اسے مار مار کر بھگا دیا۔" ہمیں بڑا غصّہ آیا۔ آج ان کے ساتھ ایسا کارنامہ انجام دیں کہ ان کی شیخی دھری کی دھری رہ جائے۔ چناں چہ رات کو ہم نے اپنی بات کو عملی جامہ پہنایا۔ ہم نے نقلی سانپ خریدا اور رات کو اُن کے سینے پر رکھ آئے۔ پھر گلاس میں پانی بھر کر اُن پر انڈیل دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے اور سانپ کو دیکھ کر چیخنے لگے، مگر پھر انھوں نے ہمیں مسکراتے ہوئے دیکھا تو ساری بات سمجھ گئے اور شرمندہ ہوئے۔ ہم نے نعرہ لگایا:

واہ رے بہادر!

تھی وائس لکھی ہیں

نونہالوں کی پسند، ناپسند، تجویزیں، شکایتیں، مشورے

● ایسا خوب صورت رسالہ آپ نے ہم نونہالوں کو دیا۔ جس میں تقریباً ہر ایک مضمون موجود تھا۔ رضوانہ گل ولد بہادر خاں، کراچی

● کہانیاں بہت پسند آئیں خاص طور پر سنگ دل کھلونے اور لال بطخ پسند آئیں۔ فصیل احمد عباسی، جھنگ۔

● ژول ورن کے ناول زیرِ زمین سفر کا ترجمہ بہت پسند آیا۔ فیاض محمود

● مجھے اور میرے دوستوں کو اُس میں دل چسپ اور معلوماتی مضامین پڑھنے کو ملے۔ سیّد محمد احمر، دستگیر

● خاص نمبر پچھلے خاص نمبروں سے بہتر نہ تھا بلکہ اس کا معیار سابقہ سے کم ہی تھا۔ سب سے بڑی خامی یہ پائی جاتی ہے کہ چاہے کتنی ہی سنجیدہ کہانی یا واقعہ یا مضمون کیوں نہ ہو اس کی تصویر نہایت مزاحیہ اور بھونڈے پن سے بھرپور ہوتی ہے۔ مانا کہ مشتاق صاحب ایک اچھے کارٹونسٹ ہیں، مگر ہر تصویر کو کارٹون تو نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ محمد اشرف آزاد، تھرپارکر

● جناب علی اسد جیسے بڑے ادیب کی کوئی کہانی بھی خاص نمبر میں شامل نہ کر کے نونہالوں کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔ شاہانہ صدیقی، کراچی

> بلاعنوان کہانی جناب علی اسد ہی کی ترجمہ کی ہوئی تو ہے۔ فہرست اور پہلی بات نہیں پڑھی۔

● ڈاکٹر سہیل برکاتی کا سائنسی مضمون ساحلی جنگلات بہت ہی خوب تھا۔ مرتضیٰ حسن علی، کراچی

● اس مرتبہ خاص نمبر اتنی زیادہ تعریف کے لائق تو نہ تھا لیکن اچھا تھا۔ خاص طور پر حکیم محمد سعید صاحب کا جاگو جگاؤ بہت پسند آیا۔ اے زیڈ خالدی، شہداد پور

● میرے پاس جولائی ۱۹۶۰ء کا نونہال موجود ہے، مگر خط دوسری مرتبہ لکھ رہا ہوں۔ پہلی مرتبہ خط لکھ کر معلوم ہوگیا کہ آپ خط صرف کراچی والوں کے ہی شائع کرتے ہیں۔ غلام سرور، ٹنڈو الہ یار۔

● خاص نمبر نے تو کمال ہی کر دیا۔ ایم حمید ادم، کراچی۔

● خاص نمبر کا صرف سرورق گزارے کے قابل تھا اور چند گنی چُنی کہانیاں باقی سب کہانیاں وہی پرانے اور گھسے پٹے موضوعات لیے ہوئی تھیں۔ اس کی واضح مثال رضیہ سلطانہ، آٹھویں سالگرہ، خزانے کا محافظ اور بلاعنوان جیسی بے سروپا، پرانے موضوع اور گھسی پٹی کہانیاں ہیں۔ اس خاص نمبر میں اچھا ہوا کہ آپ نے کچھ اچھی جدید کہانیاں شائع کر دیں۔ ایم رفیق زاہد، گوادر

● کہانیوں میں سنگ دل کھلونے (معراج)، خزانے کا محافظ اور لال بطخ (میرزا ادیب) بہت پسند آئیں۔ لطیفے معیاری تھے۔ ایم عتیق الرحمٰن، کراچی

● ہمدرد نونہال میں بہت توجہ اور شوق سے پڑھتی ہوں اور بالخصوص تحفے اور جاگو جگاؤ پر عمل کرنے کی بھی کوشش کرتی ہوں۔ عظمیٰ اظہار، راولپنڈی

● "خاص نمبر" میں کوئی مزہ نہیں آیا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمدرد نونہال کو بچوں کے علاوہ بڑے بھی پڑھتے ہیں، مگر اس بار ہر کہانی آٹھ نو سال تک کے بچے کے ذہن کے مطابق نظر آئی گھریلو چٹکلے، بلاعنوان کہانی اور لطیفے اچھے تھے۔ آپ نے اس بار قیمت صرف سات روپے رکھی جو کہ ایک نہایت ہی قابلِ تحسین و قابلِ تقلید عمل ہے۔ محمد سجاد اصغر، لاہور

● یہ "خاص نمبر" بھی پچھلے تمام خاص نمبروں کی طرح بہت خوب صورت تھا تمام کہانیاں اور مضامین پسند آئے۔ لطیفے اور تحفے بہت اچھے تھے۔ ڈاکٹر سید اسلم اور محترمہ عفت گل اعزاز کے مضامین بھی بہت پسند آئے۔

سید نوید اقبال احمد شمسی، کراچی

● خاص نمبر بہت بہت پسند آیا لیکن آپ نے نونہال ادیب پر توجہ نہ دی جب ہی اس میں کئی کہانیاں ایسی تھیں جو پہلے بھی شائع ہو چکی ہیں چلو خیر ان کہانیوں کے ساتھ "مرسلہ" لکھا تھا لیکن جناب ایک کہانی "احسان کا بدلہ" جس کو "امیر علی امیر" نے اپنی ذاتی سمجھ کر شائع کرایا ہے۔ وہ رسالہ "ٹوٹ بٹوٹ" میں سے نقل کی گئی ہے۔

صائمہ سیف، کراچی

● میری اردو پہلے اچھی نہیں تھی تو میری امی نے مجھے مشورہ دیا کہ میں نونہال پڑھوں۔ میں نے نونہال پڑھا اور مجھے وہ بہت اچھا لگا اور اب نونہال پڑھنے کی وجہ سے میری اردو بہت بہتر ہو گئی ہے۔

زہرہ نیازی، کراچی

● مجھے خاص کر "ہر نوٹے نے کہانی لکھی" (رؤف پاریکھ) اور جمعراتی (مسعود احمد برکاتی) پسند آئی۔ ذہنی آزمائش کا مقابلہ آسان تھا، لیکن آپ سے اجازت کے بغیر ان کے جوابات نہ بھیج سکی۔

عشرت جہاں، شکارپور

اجازت کی ضرورت ہے اور نہ کوئی شرط۔

● جاگو جگاؤ نے بہت متاثر کیا، رضیہ سلطانہ بھی اچھی کہانی لگی جناب حکیم محمد سعید کی تحریر کیسے بھول جاؤں نے بھی معلومات میں اضافہ کیا۔ 'خزانے کا محافظ' اچھی کہانی تھی۔ کارٹون بھی اچھے لگے۔ مسکراتے رہو میں بہت اچھے لطیفے تھے۔ مزا آگیا۔

گلشن کمار ڈھاڈر

● میں نے تقریباً بچوں کے سب مشہور رسالوں کے خاص نمبر پڑھے ہیں، لیکن جو شان نونہال کے مقدر میں ہے وہ کسی دوسرے رسالے کے مقدر میں نہیں ہے۔ اتنا اچھا خاص نمبر نکالنے پر آپ کو اور نونہال کے دیگر معاونین کو اور جناب حکیم محمد سعید صاحب کو بہت بہت مبارکباد۔ ایک خوش خبری سنیے میرے کہنے پر میرے ۱۱ دوستوں نے اس مرتبہ خاص نمبر خریدا اور سب نے بہت تعریف کی ان کو نونہال خریدنے کی ترغیب دینے کے لیے مجھے نونہال کے پرانے شمارے سب دوستوں کو باری باری پڑھنے کے لیے دینے پڑے۔ ایک میرا دوست غریب تھا اس کو میں نے اپنی جیب سے خاص نمبر خرید کر دیا

حافظ ضیاء الحق قمر، لاہور۔

● آپ کی کہانی "جمعراتی" پسند آئی مگر اُس کا نام "برکاتی" ہونا چاہیے تھا (بُرا نہ مانیے گا) رؤف پاریکھ کی کہانی بھی پسند آئی۔

نسیمہ کنول، کراچی

● کہانیوں میں لال بطخ، ہر نوٹے نے کہانی لکھی، سلسلہ دار کہانی وارث کی تلاش، سنگ دل کھلونے، زیرِ زمین سفر، مگر دوتا گرفتار ہو گیا، نظموں میں برسات کا سماں اور بچہ اور مرغا پسند آئیں۔ جناب محترم حکیم محمد سعید کی بچپن کی یادیں (کیسے بھول جاؤں) بہت پسند آئیں۔

ایم جنید حیدری، میانوالی

● خاص نمبر کی ہر تحریر لاجواب ہے۔ تصویریں فن کا بہترین نمونہ ہیں۔ مشتاق صاحب اچھے کارٹونسٹ ہیں۔ ٹائیٹل بہت پیارا ہے۔ میرزا ادیب، معراج، اور مسعود احمد برکاتی کی کہانیاں خاص طور پر پسند آئیں۔ علی اسد صاحب کی بلاعنوان بھی بہت اچھی تحریر تھی۔

محمد توصیف اقبال، خانیوال

● جناب حکیم محمد سعید کا جاگو جگاؤ بہت پسند آیا۔ زیرِ زمین سفر (ناول) یقیناً بہترین تخلیق ہے۔

شگفتہ پروین، کراچی

● جو مضامین بہت زیادہ پسند آئے ان میں بلا عنوان کہانی، خزانے کا محافظ، زیرِ زمین سفر، سیاروں کی دنیا اور ایشائی کھیل، عجیب عجیب باتیں، عجیب وغریب اتفاقات، جاگو جگاؤ اور اقوالِ حکیم شامل ہیں۔

محمد نایاب ادریس، کراچی

● سرورق بہت خوب صورت تھا اور حسین آٹوگراف بک نے تو رسالے کو چار چاند لگا دیے تھے۔ جاگو جگاؤ نے دِل پر بہت اثر کیا۔ کہانیوں میں زیرِ زمین سفر (فہیم سبزواری) جمعراتی (برکاتی)، ہر نوٹے نے کہانی لکھی (رؤف پاریکھ) اور سلسلہ وار ناول وارث کی تلاش مزیدار کہانیاں تھیں۔ لطیفے بھی چٹ پٹے تھے۔

محمد جمشید جی، میانوالی

● اگر خاص نمبر میں کچھ "خاص" تھا تو وہ صرف حکیم سعید انکل کی تحریر "کیسے بھول جاؤں" تھی جو بہت مزے دار تھی۔

ثروت رحمان، کراچی

● چمکتا دمکتا خوب صورت رنگوں سے سجا خاص نمبر بے حد پسند آیا۔ تمام کہانیاں اور مضامین خوب تھے۔ صداقت زماں، کھلابٹ

● مجھے خاص نمبر اتنا پسند آیا کہ مجھے خط لکھنا پڑا۔

مستجاب ادریس، کراچی

● نونہال میرا پسندیدہ رسالہ ہے اور میں اِسے بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آمنہ جمشید۔ راولپنڈی

● میں ہر وقت اپنے دوستوں سے نونہال کی تعریف کرتا ہوں لیکن جب نونہال آتا ہے تو میری کوئی چیز شائع نہیں ہوتی تو میں دوستوں سے بہت شرمندہ ہوتا ہوں۔ محمد ساجد بلوچ جال۔ راجن پور

> تمھاری تحریر شامل نہ ہونے کے باوجود تم رسالے کی تعریف کرتے ہو، دوستوں کو تمھارے انصاف کا قائل ہونا چاہیے اور تمھیں شرمندگی کے بجائے فخر۔

● جب سے خاص نمبر ملا ہے ہماری راتوں کی نیندیں اڑ گئیں۔ جب تک نونہال پڑھ نہ لیں رات کو نیند نہیں آتی۔ حکیم محمد سعید صاحب کا جاگو جگاؤ بہت پسند آیا سارا رسالہ مزے دار تھا۔

مرزا مقیم مغل، ٹنڈو جام

● خاص نمبر کو جس طرح سجایا گیا تھا اس کی تعریف کرنے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ محمد مبشر حسن، کراچی

● سرورق بہت پسند آیا۔ کہانیوں میں فرخندہ کی سہیلی، رضیہ سلطانہ، ہرنوٹے نے کہانی لکھی، سنگ دل کھلونے اور خزانے کا محافظ پسند آئیں۔ جناب حکیم صاحب کا جاگو جگاؤ بہت اچھا تھا۔ لطیفے اور نظمیں سبھی اچھے تھے۔ غازی صلاح الدین، سرگودھا۔

● خاص نمبر میں جاگو جگاؤ کے ساتھ پورا کا پورا رسالہ بے حد دل چسپ تھا۔ وجے کمار کشنچند دادوانی، جیکب آباد

● خاص نمبر میں حکیم صاحب کا جاگو جگاؤ بہت اچھا تھا کہانیوں میں رضیہ سلطانہ، خزانے کا محافظ، سنگدل کھلونے، زیرِ زمین سفر وغیرہ بہت اچھی تھیں۔ عاشفہ ملک، سرگودھا۔

● مسعود احمد برکاتی کے تمام مضامین پسند آئے، بلا عنوان کہانی نہایت ہی عمدہ تھی اور ہمیں عنوان تلاش کرنے میں کافی محنت کرنی پڑی۔ خاص نمبر میں محترم حکیم محمد سعید صاحب کی یادیں پڑھیں۔ واقعی ہمارے بزرگوں میں بچپن میں ہی بڑے آدمی بننے کے آثار نظر آتے ہیں۔ دلعزیز صدیقی، کراچی

● سلسلے وار کہانی "وارث کی تلاش" نے نونہالوں کے سارے گلے شکوے دُور کر دیے۔ ژول ورن کی کہانی "زیر زمین سفر" نے بھی دل خوش کر دیا۔ لطیفے بھی اچھے تھے۔

حسیب الرحمٰن میمن ٹنڈو جام

● خاص نمبر میں حکیم محمد سعید کے دونوں مضامین جاگو جگاؤ اور کیسے بھول جاؤں پسند آئے۔ اس کے علاوہ مسعود انکل کی پہلی بات رضیہ سلطانہ، سیاروں کی دنیا، ایشیائی کھیل اور سدا بہار قصے بہت پسند آئے۔ فرح بانو، کراچی

● جناب حکیم محمد سعید کا جاگو جگاؤ، جناب زکریا مائل کا رضیہ سلطانہ اور جناب معراج کی آٹھویں سالگرہ بہت اچھی تھیں۔ سیّد ندیم یوسف کا مضمون سیّاروں کی دنیا بہت پسند آیا۔

محمد عمران ظہور، ساہیوال

● ایشیائی کھیل، سیّاروں کی دنیا، پھل صحت کے لیے معلوماتی مضامین تھے۔ مسکراتی تحریریں، تقریر کی تقدیر پُر مزاح تحریریں تھیں۔ طارق محمد گھوٹکی

● خاص نمبر میں جناب حکیم محمد سعید کے جاگو جگاؤ نے بے حد متاثر کیا۔ دوسری کہانیاں السلام علیکم، ہرنوٹے نے کہانی لکھی، لال بطخ، خزانے کا محافظ، خیال کے پھول، مگر توتا گرفتار ہو گیا، تحفہ۔ کیسے بھول جاؤں، ایک ذہین چیونٹی، سنگ دل کھلونے بلا عنوان، جبراتی اچھی کہانیاں تھیں۔ عبدالحمید شیخ بھیرٹھی

● خاص نمبر میں سب کچھ بہت عمدہ تھا۔ حکیم محمد سعید کے بچپن کی یادیں بھی بہت عمدہ تھیں کہانی زیرِ زمین سفر بھی اچھی تھی۔

عبدالحمید، کراچی

● اس دفعہ کی جو گیارہ مختلف کہانیاں تھیں وہ سب ایک سے بڑھ کر ایک نکلی۔ یہ کہنا مناسب نہیں کہ وہ زیادہ اچھی تھی یا دوسری زیادہ اچھی تھی۔ گھریلو چٹکلے بہت پسند آئے۔ میرا اس دفعہ میٹرک میں 'بی' گریڈ آیا ہے۔ عائشہ کاظمی، کراچی

میٹرک میں نمایاں کام یابی مبارک ہو بیٹی، پتا نہیں لکھا اگر جواب کی فرمائش

● اس کی ایک ایک تحریر دل کو نہایت بھلی معلوم ہوئی ہماری والدہ محترمہ نے بھی اس کو نہایت شوق اور توجہ سے پڑھا امّی جان کی زبان تو جاگو جگاؤ پڑھ کر تھکتی نہ تھی بار بار تعریفی کلمات دہرا رہی تھیں۔ فرحت ذاکر، نگہت ذاکر، اورنگی

● "جاگو جگاؤ" پڑھنے کے بعد سب سے پہلے نونہال ادیب پڑھتی ہوں۔ جب میں نے شمارہ اگست کا صفحہ نمبر ۹۷ دیکھا تو ساری کی ساری خوشی اداسی میں تبدیل ہو گئی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم لوگ محنت کرنے کی بجائے دوسروں کی تحریریں معمولی سی تبدیلی کرکے بھیج دیتے ہیں۔ اس صفحہ پر نظم "جشنِ استقلال" جو کہ "ٹنڈوالہ یار کے جاوید حکیم کھوکھر" نے دو الفاظ کی تبدیلی کرکے بھیجی ہے میں نے یہ نظم اگست ۱۹۸۴ء کے رسالہ کے لیے بھیجی تھی جو کہ اگست کے رسالہ میں صفحہ نمبر ۸۸-۸۹ پر چھپی تھی۔

ربیعہ رؤف، گوجرانوالہ

● "نونہال" سے اب اتنی عقیدت ہو گئی ہے کہ اسے کوئی بُرا کہے تو مجھے بہت غصّہ آتا ہے۔

نوید رؤف، راولپنڈی

● اس ماہ کی تمام کہانیاں بہترین تھیں۔ بلاعنوان کہانی میری پسندیدہ ترین کہانی رہی۔ تجلّی الیاس، لاہور

● خاص نمبر بہت اچھا تھا۔ اس میں اچھے خاصے صفحے تھے، لیکن جب پڑھنے بیٹھے تو پتا ہی نہیں چلا کب ختم ہوا۔

معصومہ راٹھور، کراچی

● "جاگو جگاؤ" اور "السلام علیکم" سب سے زیادہ پسند آئے دوسرے نمبر پر "رضیہ سلطانہ" (جناب محمد زکریا مائل) "دو پرانی باتیں" (مسعود احمد برکاتی) "ایشیائی کھیل" (ساجد علی ساجد) "اقوالِ حکیم" اور "اللہ" نظم (جناب فیض لودھیانوی) پسند آئیں۔ لطیفے کچھ خاص نہ تھے۔ وقار احمد تربیلوی، ہری پور ہزارہ

● اس شمارے کے یوں تو سارے ہی مضامین اور تحریریں نہایت خوب صورت تھیں لیکن مسکراتی تحریریں، زیرِ زمین سفر، رضیہ سلطانہ اور حکیم محمد سعید صاحب کی تحریر "کیسے بھول جاؤں" کافی پسند آئیں۔ محمد ایوب مغل، شہداد پور

● سب سے زیادہ سید ندیم یوسف کا مضمون سیاروں کی دنیا نے متاثر کیا سیاروں کے بارے میں تفصیل سے پڑھ کر ہمارے علم میں اضافہ ہوا ہے دوسری تحریر ایشیائی کھیلوں کے بارے میں اپنے وطن کی کام یابیوں کا پڑھ کر لطف دوبالا ہو گیا۔

طاہرہ علی، کراچی

● ژول ورن کی کہانی "زیرِ زمین سفر" کا ترجمہ کچھ زیادہ دل چسپ نہیں تھا۔ مترجم نے ترجمہ کچھ زیادہ اچھا نہیں کیا تھا۔ محترمہ عفت گل اعزاز کا مضمون صحت کے اصول بہت پسند آیا۔ آپ کی تحریر کردہ کہانی "جمعراتی" بہت پسند آئی۔

امین صدرالدین بھایانی، کراچی۔

● جناب میرزا ادیب کی دونوں کہانیاں جناب رؤف پاریکھ جناب ڈاکٹر سہیل برکاتی۔ جناب معراج کی دونوں کہانیاں پسند آئیں۔ جمعراتی، دو پرانی چیزیں، السلام علیکم بھی اچھی تحریریں تھیں لیکن رسالہ کی جان "میں کیسے بھول جاؤں" تھی۔ حکیم صاحب واقعی ہر فن مولا ہیں علی اسد کی بلاعنوان کہانی میں کافی الجھاؤ تھا۔ محمد ابراہیم مصوّر، روہڑی

● سرورق تو اپنی مثال آپ تھا۔ جناب حکیم محمد سعید کے بچپن کے حالات پڑھ کر مزہ آگیا، معلوماتی مضامین کی وجہ سے اس بار کا خاص نمبر پچھلے سال کے خاص نمبر پر سبقت لے گیا۔ کہانیوں میں "ایک ذہین چیونٹی" (جناب شمیم حنفی) "سنگ دل کھلونے" "مگر توتا گرفتار ہو گیا" (جناب غلام رزاق شیخ) لاجواب تھیں، جب کہ نظموں میں نظم "اللہ" (جناب فیض لودھیانوی) اور "برسات کا سماں" (جناب سلیم فاروقی) پسند آئیں، "مسکراتے رہو" میں اس بار تمام لطائف نئے اور معیاری تھے، جب کہ "تحفوں" میں کوئی خاص مزہ نہیں آیا۔ خالد محمود قریشی، کراچی

● فیض لودھیانوی صاحب کی نظم اللہ بہت اچھی تھی۔ مسعود احمد برکاتی کی تینوں تحریریں بہت اچھی تھیں۔ میرزا ادیب صاحب کی دونوں کہانیاں نئے انداز کی ثابت ہوئیں۔ معراج صاحب کے قلم سے تین خوب صورت تحریریں پڑھنے کو ملیں۔ جناب علی اسد کی بلاعنوان کہانی سسپنس سے بھرپور تھی۔

ابن بشیر رحمانی، لاہور

● ہمدرد نونہال بہت شوق سے میں اور میرے گھر والے پڑھتے ہیں۔
محمد اختر آغا، روہڑی۔

● جاگو جگاؤ پڑھ کر ہم نے سوچا کہ اگر یہی سب ہوتا رہا تو ہمارا وطن ترقی کیسے کرے گا۔
صائمہ تاجی، کراچی

● جاگو جگاؤ کے بعد مجھے اس گلدستہ کی سب سے اچھی مہک سیاروں کی دنیا کی لگی۔
سلیم احمد خاں، کراچی

● ہمدرد نونہال کا خاص نمبر بہت شاندار تھا۔ میں نونہالوں کی دل چسپی کے لیے یہاں خاص نمبر کے اعداد و شمار لکھ رہا ہوں۔ مسعود احمد برکاتی صاحب کی پہلی بات دو صفحوں پر مشتمل تھی۔ خاص نمبر ۲۷۶ صفحات پر مشتمل تھا۔ ۱۳ اقوالِ زریں خیال کے پھول میں اور ۲۶ اقوالِ زریں دوسرے مقامات پر شائع ہوئے کُل ۱۲ نظمیں شائع ہوئیں جن میں نونہال ادیب میں ۸ نظمیں تھیں مضامین کی تعداد ۹ تھی۔ مشتاق صاحب کے ۴ کارٹون شائع ہوئے۔ کُل ۱۲ کہانیاں شائع ہوئیں جن میں ایک کہانی بلاعنوان اور قسط وار ناول وارث کی تلاش کی پہلی قسط شامل تھی کُل ۱۷ مختلف تحریریں نونہال ادیب میں شائع ہوئیں۔ جو ۱۷ صفحات پر مشتمل تھیں۔ منتخب کہانیاں میں دو کہانیاں شائع ہوئیں۔ اس شمارے کے مشکل الفاظ اس کالم میں ۲۹ الفاظ کے معنی شائع ہوئے۔ صحت مند نونہال میں ۱۴ تصویریں شائع ہوئیں۔ مسکراتے رہو میں کل ۳۲ لطیفے شائع ہوئے۔ سدابہار تحفے۔ اس کالم میں ۳۱ مختلف تحریریں شائع ہوئیں۔ نونہال مصور میں چار تصویریں شائع ہوئیں۔ اقوالِ حکیم۔ اس کالم میں جناب حکیم محمد سعید کے ۲۰ اقوال شائع ہوئے۔ معلومات عامہ میں ۲۰ سوالات پوچھے گئے جن پر کوئی انعام نہ تھا۔ عجیب عجیب باتیں میں ۵ عجیب باتیں شائع ہوئیں۔ طب کی روشنی میں۔ اس کالم میں ۱۰ طبی سوالوں کے جوابات شائع ہوئے۔ عجیب و غریب اتفاقات میں ۶ اتفاقات شائع ہوئے۔ مفید گھریلو چٹکلے میں ۱۹ چٹکلے بتائے گئے ہیں۔ ہمدرد انسائیکلوپیڈیا میں ۱۲ سوالات کے جوابات دیے گئے۔ مسکراتی تحریریں میں ۷ تحریریں شائع ہوئیں۔ بچپن کی یادیں۔ اس کالم میں جناب حکیم محمد سعید صاحب کے بچپن کی یادیں شائع ہوئیں۔ مسعود احمد برکاتی صاحب کی کل ۴ تحریریں شائع ہوئیں جن میں پہلی بات بھی شامل ہے۔ جناب معراج صاحب کی ۳ تحریریں شائع ہوئیں ۱۸ صفحات اشتہارات پر مشتمل تھے معلومات عامہ ۲۴۳ کے ۱۲ صحیح جوابات ۶ نونہالوں، ۱۱ صحیح جوابات ۶، دس صحیح جوابات ۳۸ اور نو صحیح جوابات ۲۹ نونہالوں نے دیے۔ ننھے قارئین لکھتے ہیں، اس کالم میں ۴۲ نونہالوں کے خطوط اور ۱۴ نونہالوں کے نام شائع ہوئے۔
محمد سہیل رعنا، اورنگی

● خاص نمبر میں بقول مسعود احمد برکاتی کہانیوں، مضمونوں، نظموں، معلومات، مستقل عنوانات غرض سب تحریروں کی تعداد ۵۲ ہے۔ خاص نمبر میں حکیم محمد سعید صاحب کا "جاگو جگاؤ" ایک صفحے پر جب کہ مسعود احمد برکاتی صاحب کی "اپنی بات" دو صفحات پر مشتمل تھی۔ خاص نمبر میں جناب معراج اور جناب مسعود احمد برکاتی صاحب کی تین تین تحریریں شامل تھیں۔ جناب میرزا ادیب اور جناب مناظر صدیقی کی دو دو تحریریں خاص نمبر کی زینت بنیں۔ سب تحریروں کے ساتھ جناب مشتاق کی ۷۵ بنائی ہوئی تصویروں نے تحریروں میں جان ڈال دی۔ "زیرِ زمین سفر" کے مضمون کے ساتھ گیارہ تصاویر اور "سنگ دل کھلونے" کے ساتھ "سات" تصاویر شائع کی گئیں۔ "مسکراتے رہو" میں ۳۲ لطیفے اور تحفے میں ۳۱ تحفے شامل اشاعت تھے۔ ۲۲ نونہالوں کی تصویریں خاص نمبر میں شائع ہوئیں جب کہ تین تصویریں حکیم محمد سعید صاحب کی بھی تھیں۔ "نونہال میں تحریریں بھیجنے والے نونہالوں کے لیے ادارے کی طرف سے خاص نمبر میں چار مختلف جگہ پر ہدایات دی گئیں۔ خاص نمبر کے ساتھ ایک خوب صورت آٹو گراف بک ہر نونہال

کو مفت دی گئی۔ سیف الاسلام، کورنگی

● "تحریر کی تقدیر" جو مرتضیٰ علی حسن نے اپنے نام سے بھیجی ہے۔ یہ مشہور مزاح نگار جناب پطرس بخاری مرحوم کے مضمون "مرید پور کا پیر" کی ۹۹ فی صد نقل ہے۔ پطرس بخاری ہمارے بہت بڑے اور مایہ ناز مزاح نگار ہیں۔
شاہد محمود، کراچی۔ محمد پرویز طفیل جگنو، فیصل آباد۔ کاشف، راولپنڈی

مرتضیٰ علی حسن! افسوس، یہ تم نے کیا کیا۔

● خاص نمبر پڑھ کر مزہ آگیا۔ ایسے تو نونہال کا ہر شمارہ خاص نمبر ہوتا ہے مگر اس نے تو عام رکارڈ توڑ دیے۔
عامر شمیم، لاہور چھاؤنی

● خاص نمبر میں آپ نے دو پرانی چیزیں کے مضمون میں جو آپ نے فن کے بارے میں لکھا ہے مثلاً خطاطی، خوش خطی و جلد بندی تو ان فنون کو سیکھانے کے لیے ایک مضمون قسط وار شائع کریں۔ ذوالفقار حیدر علی، کراچی

● خاص نمبر کا ٹائٹل زبردست تھا اور جب پڑھا تو میں نے دل میں کہا ایسا زبردست رسالہ تو میں نے اپنی زندگی میں نہ پڑھا تھا۔ شوکت علی نواب شاہ

● خاص نمبر پچھلے خاص نمبر سے اچھا تھا۔ قسط وار ناول شروع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ حبیب اللہ فانی، میانوالی

● "طب کی روشنی میں"، "ہمدرد انسائیکلوپیڈیا" اور "معلوماتِ عامہ" نے اب تک میری توجہ کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔
عائشہ راشد، کراچی

● جب میری نظر ٹیک اسٹال میں پڑے ہوئے ہمدرد نونہال پر پڑتی ہے تو میں بہت خوشی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میری نظر گلاب کے پھولوں کے گلدستے پر پڑی ہو۔ نونہال پڑھ کر میرے دل و دماغ کو سکون ملتا ہے۔
شیخ مجید ساحر، لاڑکانہ

● اس بار تو مراد یب نے کمال کر دکھایا۔ غلام مصطفےٰ، سانگھڑ

● خاص نمبر کا ہر صفحہ دل چسپ تھا۔ احمد علی زیدی، حیدرآباد

● جب میں پرائمری میں پڑھتا تھا تو نونہال پڑھنا شروع کیا تھا۔ آج میں کالج میں ہوں اور نونہال کا وہی شوق ہے۔ سید شمیم، ملتان

ان نونہالوں کے نام جنھوں نے ہمیں بہت اچھے خط لکھے، لیکن جگہ کی کمی کے باعث ان کے صرف نام دیے جا رہے ہیں۔

کراچی:۔ محمد اعجاز، محمد علیم، ہما گلنار، عفنفر مشکور صدیقی، آصف عباسی، کاشف عباسی، سید شاہ عابد حسین، سید حامد حسین، ایم سہیل عباس، ایم ظہیر عباس، ندیم اختر عمران، فراز اطہر، ایس مسعود حسین، محمد عمیر، فیصل احمد، ساجد حسین، انیس احمد، ریحانہ امین، سعید احمد، محمد خالد یامین، محمد اقبال الحق، رئیس احمد، رخسانہ ناز، محمد زاہد احمد، اظہر حمید عارف حسین، محمد قیصر امام، عبدالقادر قاسم، سید کاظم حسین برنی، نسرین درشہوار، محمد آصف، محمد صادق ٹیلر، روبینہ فرید، ثمینہ اسماعیل، محمد ارشد حنا ناز، کاشف احمد خاں، ناصر حمید، لبنیٰ کنول، سید فاخر جلال، ناہید فاروق۔ سٹاہ پور چاکر: غلام مصطفےٰ۔ لاہور: جہانگیر مسعود۔ سکھر: محمد عبور خان۔ کوٹ ادو: محمد یونس، ٹنڈو آدم: عبدالروف۔
حیدرآباد:۔ محمد اعجاز آفاق صدیقی، تسنیم عالم، نعیم گل، کامران خالد محمد علی مشیر، ذکی احمد خان، ٹنڈو جام: محمد ندیم بیگ مغل۔ مردان: عبدالغفار، سعودی عرب: محمد طفیل ضیاء۔ چمن: سیف اللہ خوشی محمد۔ جیکب آباد: محمد مسلم۔ بالا: نصیر الدین۔ لاڑکانہ: ریحانہ سجاد انصاری۔ جمرود: عالمگیر آفریدی۔ لاڈہ: محمد مسعود یوسف۔ فیصل آباد: عامر یوسف، توزیر رشید شیخ۔ جھنگ: محمد فاروق، سانگھڑ: محمد انور میمن۔ منگورہ: ایس اختر علی۔ ڈیرہ اسماعیل خان: محمد اعظم اٹک: جمیل الدین احمد۔ ڈگری: عنایت اللہ۔ جھڈو: فرحت فضل حسین راجن پور: سجاد احمد بلوچ، جام پور: شفقت رسول خیرپور میرس: الطاف اللہ شیخ۔ میانوالی: رحمت اللہ۔ کھیوڑہ: راجہ تنویر احمد۔ بھاولنگر: بدر احمد

(باقی خاص خاص خط اور نام آیندہ مہینے دیے جائیں گے۔)

معلوماتِ عامہ (۲۴۵) کے صحیح جوابات

خاص نمبر میں معلومات عامہ ۲۴۵ کے سوالات پر اس بار نقد انعام نہیں رکھا گیا تھا، لیکن جوابات اور نام اور تصویریں شروع صفحات میں شائع کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا، چناں چہ وعدہ پورا کیا جا رہا ہے۔ بیس جوابات صحیح بھیجنے والوں کے نام ذرا موٹے قلم سے لکھوائے گئے ہیں۔ ہم نے یہ بھی اعلان کیا تھا کہ ۱۸ صحیح جوابات بھیجنے والوں کے صرف نام شائع کریں گے، لیکن نونہالوں نے جس شوق اور محنت سے جوابات دیے ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے ۱۹۔ اور ۱۸۔ صحیح جوابات والوں کی تصویریں بھی شائع کی جا رہی ہیں اور ۱۷ صحیح جوابات والوں کے صرف نام۔ ہم سب نونہالوں کو مبارک باد دیتے ہیں۔

معلومات حاصل کرنے کا شوق بہت مفید شوق ہے معلومات زندگی میں ہر وقت کام آتی ہیں۔ روزانہ کوئی نہ کوئی رسالہ یا کتاب پڑھیے اور اپنی معلومات بڑھاتے رہیے۔

۱۔ قرآن شریف میں حضرت یوسفؑ کے قصّے کو احسن القصص کہا گیا ہے۔

۲۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو میزبانِ رسولؐ کہا جاتا ہے۔

۳۔ قائدِاعظم محمّد علی جناح نے پاکستان کا پہلا وزیر دفاع شہیدِ ملّت لیاقت علی خان کو مقرر کیا تھا۔

۴۔ برصغیر پاک و ہند کے اس بادشاہ کا نام ظہیر الدین بابر تھا جو دو آدمیوں کو اپنی بغلوں میں دبا کر قلعہ آگرہ کی دیوار پر دوڑتا تھا۔

۵۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے وفادار ہاتھی کا نام مولا بخش تھا۔

۶۔ سندھ کے مشہور ادیب اور دانشور مرزا قلیچ بیگ نے سب سے پہلے محکمۂ مال (Revenue) میں ملازمت کی تھی۔

۷۔ جناب نسیم حجازی کا اصل نام محمد شریف ہے اور مولانا کوثر نیازی کا اصل نام محمد حیات ہے۔

۸۔ پاکستان، بھارت اور سری لنکا نے برطانیہ سے آزادی ۱۹۴۷ء میں حاصل کی تھی۔ برما کی آزادی کا اعلان تو ۱۹۴۷ء میں ہو گیا تھا، لیکن عملاً وہ جنوری ۱۹۴۸ء میں آزاد ہوا۔

۹۔ انگریزی کتاب "قائداعظم جناح۔ اسٹوری اوف اے نیشن" سندھ کے مشہور دانشور جناب جی الانہ مرحوم نے لکھی تھی۔

۱۰۔ کرکٹ کے کھیل میں ایک وکٹ سے دوسرے وکٹ کا فاصلہ ۲۲ گز یا ۲۰ میٹر ہوتا ہے۔

۱۱۔ ایک بار ۱۹۲۴ء میں اولمپک کھیلوں میں ہاکی کو نظر انداز کیا گیا تھا۔

۱۲۔ مشہور عالم ادیب اور صحافی مولانا ابوالکلام آزاد مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے تھے۔

۱۳۔ برطانیہ کی موجودہ ملکہ الزبتھ ۱۹۵۲ء میں تخت نشین ہوئی تھیں۔

۱۴۔ مقتدرہ قومی زبان کے موجودہ صدر نشین جناب ڈاکٹر وحید قریشی ہیں۔

۱۵۔ ملک ارجنٹینا کے دارالحکومت کا نام بیونس آیرس ہے۔

۱۶۔ "میں ساز ڈھونڈتی رہی" مشہور و ممتاز شاعرہ محترمہ ادا جعفری کے مجموعۂ کلام کا نام ہے۔

۱۷۔ البانیہ کے سکّے کا نام لیک (LEK) ہے۔

۱۸۔ ۱۹۸۶ء میں لاہور کے ایک مشہور اردو رسالے نقوش کے مدیر جناب محمد طفیل کا اسلام آباد میں انتقال ہوا ہے۔

۱۹۔ آسٹریلیا کی جس ریاست کا نام برطانیہ کی ایک ملکہ کے نام پر ہے وہ ہے ریاست وکٹوریا۔

۲۰۔ کرکٹ کے سلسلے میں آئی۔سی۔سی کا نام لیا جاتا ہے۔ اس سے "انٹرنیشنل کرکٹ کانفرنس" مراد ہے۔

(بیس) صحیح جوابات بھیجنے والوں کے نام

کراچی

سیّد اعزاز شکیل کرمانی
سیّد کمال اظہر علی کرمانی
سمیرا رشید ذکی علوی
سیّد نہال اظہر علی کرمانی
سیّد فراز اطہر کرمانی
عبدالرحمٰن
احد رشید ذکی علوی
سمیرا ارشد ذکی علوی
ارشد رشید ذکی علوی
اسد رشید ذکی علوی
فرحان فرخ

خیرپور میرس

شگفتہ سحر
شازیہ گل شیخ
الطاف اللہ شیخ
اعظم علی سومرو
توقیر محمد صدیقی
تنویر احمد صدیقی
قدیر محمد صدیقی
عباد علی سحر، لاہور

ملتان

شیراز احمد
طاہرہ نصیر
پرنس غلام مرتضےٰ غوری

بیس صحیح جوابات بھیجنے والوں کی تصاویر

انیس صحیح جوابات بھیجنے والوں کے نام

کراچی

مجیب ظفر انوار
بشریٰ ظفر انوار
زرین عثمانی
ظفر احمد عثمانی
خواجہ بدرین احمد
ایم، ظہیر عباس
ایم، سہیل عباس
ایم، حمیرا ارم
محمد ذیشان ایوب
فرحانہ رفیق سبحانی
سید عارف علی

ملتان

عبدالرشید عامر
محمد اسد ساقی
شاہین عباس ساحر
مرزا ارشد بیگ
حمیرا حمید
عظمیٰ حمید
محمد احسن بیگ

ٹنڈو آدم

شیخ طارق علی
محمد الیاس
محمد سعید احمد
ماجد علی
آفتاب احمد
زاہد علی
عبدالرؤف
مشتاق احمد
محمد افراہیم شیخ

مختلف شہروں سے

عاجز عبدالرحمٰن رند، سانگھڑ
سید محسن شباب، حیدرآباد
سید خاور حسین، حیدرآباد
وزیر حسین شاہ نقوی، خیرپور میرس
محمد طاہر ارائیں، سنجھورو

انیس صحیح جوابات بھیجنے والوں کی تصاویر

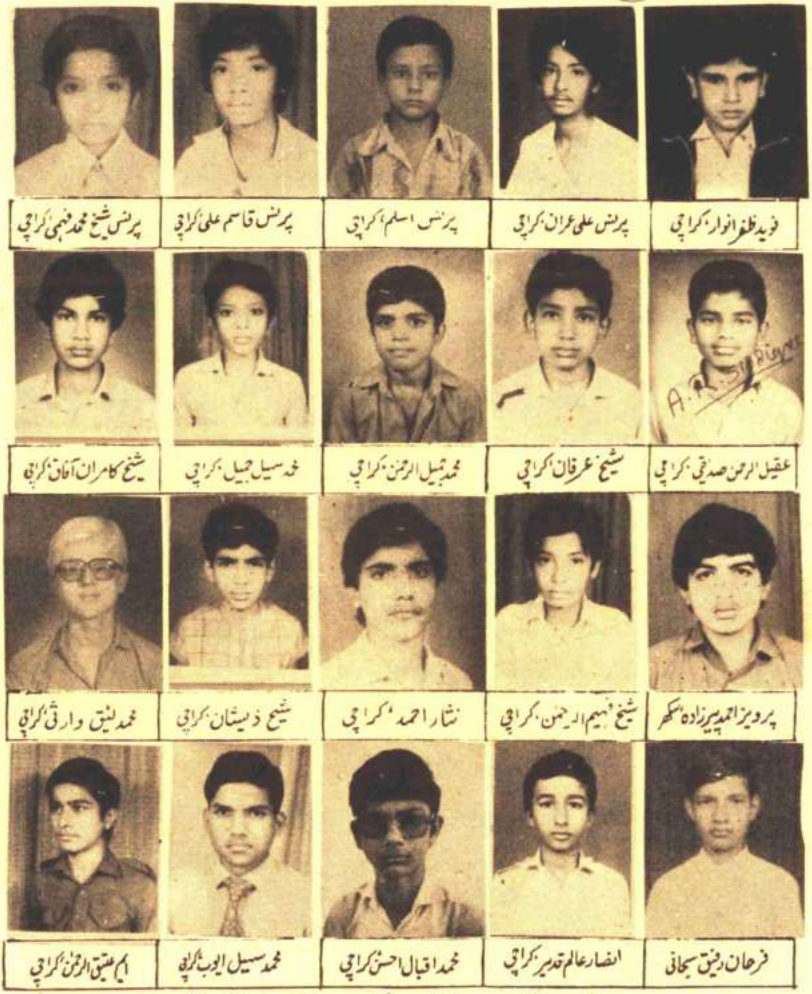

نوید ظفر انوار، کراچی

پرنس علی عمران، کراچی

پرنس اسلم، کراچی

پرنس قاسم علی، کراچی

پرنس شیخ محمد فہمی، کراچی

عقیل الرحمن صدیقی، کراچی

شیخ عرفان، کراچی

محمد جمیل الرحمن، کراچی

محمد سہیل جمیل، کراچی

شیخ کامران آفاق، کراچی

پرویز احمد پیرزادہ، سکھر

شیخ فہیم الرحمن، کراچی

نثار احمد، کراچی

شیخ ذیشان، کراچی

محمد لئیق وارثی، کراچی

فرحان رفیق سجانی

انصار عالم تدبیر، کراچی

محمد اقبال احسن، کراچی

محمد سہیل ایوب، کراچی

ایم عتیق الرحمن، کراچی

اٹھارہ صحیح جوابات بھیجنے والوں کے نام

کراچی: سید ذوالفقار حسین موسوی — محمد عابد علی خان — سید نظر حسین زیدی

ہاجرہ الفاطمہ	خواجہ مجیب احمد	سکھر	تحسین فاطمہ چیمہ، ملتان
محمد یوسف منیر کھوکھر	خواجہ مقبت احمد	ارم	محمد واصف ممتاز، لاہور
خواجہ معین احمد	خواجہ مُبین احمد	رضوانہ ارم	شکیل احمد، جمرود خیبر ایجنسی
فریحہ ناز مُنیر	طاہرہ مقبول موسوی	مختلف شہروں سے	ارشاد حسین ندیم ڈھیروی،
خواجہ متین احمد	سانگھڑ	وقار احمد چیمہ، ملتان	میانوالی۔
سیّد محمد علی سیّد راشد علی	محمد امین سیف الملوک	اخلاق احمد چیمہ، گجرات	شکیل الرحمٰن صدیقی کراچی
اورنگ زیب علی پاشا	فیصل سلیم	سلمٰی رؤف، میرپور خاص	

اٹھارہ صحیح جوابات بھیجنے والوں کی تصاویر

سیّد معز الدین، کراچی | عذرا اطہر، کراچی | اسما مہر، کراچی | سیّدہ ثمر حسین زیدی، کراچی | رئیس احمد قدیر، کراچی

روبینہ خلیل، کراچی | شبیر خان، کراچی | محمد سرور اقبال، کراچی | شمشیر خان، کراچی | سہیل اختر خان، حیدرآباد

انور حسین صدیقی، کراچی | رانی نیر خلیل، کراچی | فخر الدین، کراچی | محمد اختر جمال، کراچی

سترہ صحیح جوابات بھیجنے والوں کے نام

کراچی

اشہر سعید عالم
ازہر محمود عالم
نصرت پروین انصاری
محمد ندیم اسلام
ظفر حسین صدیقی
محمد ریاض الدین قریشی
حمیرا فلک ناز
شرمین حمیرا صدیقی
ندیم احمد صدیقی
فہیم احمد صدیقی
نور الحسن انصاری
ارم شہزاد
محمد اظہر شہزاد
سید واجد علی
زبیر المحمود

سکھر

حمیرا فاز
فہیم عابدی
عالیہ نزہت

فیصل آباد

محمد وسیق دارثی
سمیع اللہ

گجرات

جنید احمد چیمہ
تاثیر احمد چیمہ
عثمان احمد چیمہ
بلال احمد چیمہ

مختلف شہروں سے

عتیق الرحمٰن سکندری، حیدرآباد
سید جاوید حیدر شاہ، راولپنڈی
محمد ذاکر قریشی، ٹنڈو الہ یار
محمد ارشد، بہاولپور
منیر احمد میمن، جیکب آباد
سلمان شیخ، حیدرآباد

کراچی میں ہمدرد کی کتابیں

ہمدرد سینٹر ناظم آباد کے علاوہ اِن دُکانوں سے بھی ملتی ہیں

- طاہر بُک ڈپو، پریڈی اسٹریٹ، صدر
- البدر بُک کارپوریشن، پریڈی اسٹریٹ، صدر
- کراچی بُک ڈپو، اردو بازار
- البلال بُک سینٹر، اردو بازار
- علمی کتاب گھر، اردو بازار
- مدینہ پبلشنگ کمپنی، ایم۔اے جناح روڈ
- السجاد اسٹیشنرز، نزد پاپوش ریلوے کراسنگ، ناظم آباد

نزلہ، زکام اور کھانسی

سے محفوظ رہنے کی آسان تدبیر

سُعالین شیشی کے علاوہ نئی اسٹرپ پیکنگ
میں اب پہلے سے زیادہ محفوظ۔

مناسب احتیاط برتئے۔ بروقت سُعالین لیجیے

ہمدرد

ہم خدمت خلق کرتے ہیں

نومبر ۱۹۸۶ء — ہمدرد نونہال — رجسٹرڈ ایم نمبر ۶۹